تعلیمی خطبات

تعلیمی خطبات

ڈاکٹر ذاکر حسین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار

دہلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ

بمبئی ۳

[illegible]

چھٹی بار ۱۰۰۰ قیمت: چار روپے پچاس پیسے

جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

آپا جان گرڈا فلپس بورن کے نام

آپا جان! اس کتاب کے آخری حصے آج چھپ کر آئے ہیں۔ ان تقریروں میں میں نے جو کچھ کہا ہے اور جس طرح کہا ہے، اس میں آپ کا بہت حصہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ اجازت دیں تو اس مجموعے کو آپ کے نام منسوب کروں۔

آپ اس وقت بڑی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ آپ نے اپنی محبت اور خدمت سے جامعہ کے سب ساتھیوں کے دل میں جو جگہ بنالی ہے اس کا اندازہ شاید خود آپ کو نہ ہو۔ اگر درد بٹ سکتا تو یہ سب اس کو تقسیم کر لیتے اور اس کا سارا بوجھ آپ ہی پر نہ چھوڑتے۔ لیکن کیا کیجیے کہ یہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ بس یہ دعا ہے کہ جس نے یہ تکلیف آپ پر رکھی ہے وہی اس کی برداشت کی طاقت اور اس پر صبر کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کی مشکل کو آسان کرے۔

جامعہ نگر
۱۱ مارچ ۱۹۴۳ء

آپ کا ساتھی
ذاکر حسین

فہرست مضامین

پیش لفظ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہ خطبات نہ جانے کتنی مشکل سے لکھے گئے اور اب کتنے پس و پیش کے بعد شائع کیے جا رہے ہیں۔ آپ اسے یقین نہ کریں گے، اور زبان کی روانی اور بیان کی قدرت جو ان خطبات کی ایک نمایاں خوبی ہے خود اس کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھنے میں کوئی دشواری، کوئی تکلف نہ ہوتا ہوگا، پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ یہ کام جو مصنف کی استعداد کو دیکھتے ہوئے کوئی دیر طلب کام نہیں، بہت مشکل سے انجام پا سکا ہے۔ خطبات کی زبان کی روانی قلم کی روانی نہیں ہے۔ بیان کی قدرت وہ نہیں ہے جو ادیب مشق سے حاصل کرتے ہیں، یہ اس طرح لکھے ہی نہیں گئے جیسے کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ کتاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم اور علم کے ساتھ انسان کو اپنے اندر بند کرلے، اور اس لیے ہر کتاب نامکمل رہ جاتی ہے، جیسے وہ کپڑا جو پہننے والے کا جسم دیکھے بغیر

کاٹا گیا ہو۔ ادبی تصانیف میں زبان کی قینچی اکثر کاٹنے والے کے قابو میں نہیں رہتی، خود اپنے ہنر دکھانے لگتی ہے۔ ان تعلیمی خطبات میں وہ خامی نہیں ہے جو کتاب میں ہوتی ہے، اور قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر ان میں وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو ادیبوں کی تحریر کو برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان خطبات میں انداز تقریر کا ہے، تحریر کا نہیں۔ ان میں کوشش کی گئی ہے کہ قلم اور کاغذ اور کتاب کو درمیان سے ہٹا کر آپ سے براہِ راست بات کہی جائے اور اس طرح کہی جائے کہ آپ کے دل کو لگے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص ہر ایک سے اور ہر موقع کے مناسب بات کہنا چاہتا ہو اور کہہ سکتا ہو، اسے کتنا ناگوار ہوگا کہ نظر نیچی کر کے بیٹھے اور قلم کو کاغذ پر چلائے، اپنی تحریر کو دیکھے اور مخاطب کو بھول جائے، کتاب لکھے اور سمجھے کہ دل سے دل کی راہ یہی ہے۔

یہ تعلیمی خطبات مختلف موقعوں کے لیے، مختلف لوگوں کے اصرار پر تیار کیے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کا موضوع تعلیم کا کوئی بنیادی مسئلہ، کوئی اہم پہلو ہے، اور مجموعی طور پر ان کا مقصد آپ کو سچی تعلیم سے روشناس کرنا اور اس کا یقین دلانا ہے کہ وہ کام جسے انجام دینا آپ ایک خاص سرکاری محکمے کے ملازموں کا منصب سمجھتے ہیں، خود آپ کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا کام ہے۔ ان خطبات کو پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن میں تعلیم، درجہ اور امتحان، نصاب اور کتاب پر مشتمل یا کسب معاش پر منحصر نہ رہے گی بلکہ

خود ان بندشوں سے آزاد ہوکر آپ کو آزاد کرے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ تعلیم کا سلسلہ شعور کو بیدار کرنے والے اثرات سے شروع ہوکر کلامِ الٰہی میں انتہا اور تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس میں معلموں کا منصب یہ ہے کہ تعلیم کی مختلف منزلوں میں رہنمائی کریں اور تعلیم حاصل کرنے والے کا فرض یہ ہے کہ معلم سے معلم کا پتا پوچھتا ہوا علم کے سرچشمے تک پہنچے۔ یہ تعلیم انفرادی تو ہوگی، کہ ہر شخص اس سے اتنا ہی فیض حاصل کرے گا جتنا کہ اس کا ظرف ہو، لیکن علم کے لیے مقاصد معین کرنا اور اس کی تحصیل کا انتظام کرنا جماعت کے اختیار میں ہے، اس لیے آپ کو ان تعلیمی خطبات میں اس نظامِ تعلیم کے خاکے ملیں گے جو علم کی روشنی کو گھر گھر پھیلا سکتا ہے، سوئی ہوئی قوتوں کو جگا سکتا ہے، اور فرد اور جماعت کے درمیان وہ سچی ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے جو مذہب، اخلاق، سیاست سب کا نصب العین ہے۔ تعلیم کی روح کو اس کے جسم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے دل میں جتنی قدر تعلیم کے اس تصور کی پیدا ہو جو ان خطبات میں پیش کیا گیا ہے اتنا ہی حوصلہ آپ کو اس کا بھی ہونا چاہیے کہ آپ کی کوشش سے یہ تعلیم ایک عام اور پائدار نظام کی شکل اختیار کرے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۱۷ / اکتوبر ۱۹۴۲ء

محمد مجیب

قومی تعلیم

(یہ وہ خطبہ ہے جو کاشی ودیاپیٹھ کے جلسۂ
تقسیم اسناد میں ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء کو پڑھا گیا)

میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے اس جلسے میں بُلا کر اور تقریر کرنے کی اجازت دے کر میری بڑی ہی عزت افزائی فرمائی۔ میرا کام چوں کہ مجھے برابر طالب علموں کے ساتھ رکھتا ہے، اس لیے اپنی طالب علمی کے اور آج کل کے زمانے میں مجھے کبھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ میں اپنے کو آج بھی اسی طرح طالب علم سمجھتا ہوں جیسا کہ آج سے پندرہ بیس سال پہلے سمجھتا تھا۔ اس لیے جب مجھے آپ کے کل پتی جی، ہم سب کے بزرگ اور مخدوم، ڈاکٹر بھگوان داس صاحب کا تار ملا کہ تم کاشی ودیا پیٹھ کے کنووکیشن کے جلسے میں آکر کچھ کہو تو مجھے بہت ہی اچنبھا ہوا۔ ایسا ہی اچنبھا جیسا کہ آپ کے کسی کم عمر طالب علم کو یہ تار پاکر ہو کہ تم آکر جامعہ ملیہ کے تقسیم اسناد کے جلسے میں خاص تقریر کرو۔ اسی وجہ سے میں نے

جواب میں بھی ذرا دیر کی، اور میرا پہلا خیال یہی تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب سے معافی چاہوں اور یہ لکھوں کہ شاید آپ نے تار میں غلط آدمی کا پتا لکھ دیا ہے۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ شاید اس بلاوے میں ایک اور بات چھپی ہے، یعنی یہ کہ جامعہ ملیہ میں میرے ساتھی قومی تعلیم کا جو کام بڑے کٹھن حالات میں کر رہے ہیں، اس میں کاشی ودیا پیٹھ کے بھائی اور ساتھی، جو خود اسی قسم کے کام میں لگے ہوئے ہیں، ہماری ہمت بڑھانا اور اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنی ذات کی طرف سے تو معافی مانگ لیتا، مگر میرے دل میں آپ کے کام اور آپ کے کام کرنے والوں کی جو عزت ہے اس نے اجازت نہ دی کہ ان کی اس ہمت افزا دعوت کو رد کر دوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت آپ کے سامنے حاضر ہوں۔

آج سے کوئی پندرہ سال پہلے، جب اس ودیا پیٹھ کی بنیاد رکھی گئی تھی، تو وہ زمانہ ہماری قوم کے لیے بڑی بے چینی کا زمانہ تھا۔ اس بے چینی کا سلسلہ اب تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے، کبھی ابھر آتی ہے، کبھی دب جاتی ہے۔ اس بے چینی نے ہماری قوم میں بڑی بیداری پیدا کی ہے اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں نے اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب اس بیداری کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس زمانے میں قومی تعلیم گاہوں کا قیام ہماری قومی زندگی کے لیے شاید سب سے زیادہ اہم واقعہ تسلیم کیا جائے گا جس طرح سخت بیماری کی حالت میں جسم اپنے روگ کو دور کرنے کے لیے قدرتی طور پر

کچھ نہ کچھ کرتا ہے، اور اس میں سوچ بچار کو زیادہ دخل نہیں ہوتا، اسی طرح ہماری قوم نے بھی قومی تعلیم کے معاملے کو کچھ بہت زیادہ سوچا تو نہ تھا، لیکن جب دکھ بڑھا تو اس نے اسے رفع کرنے کے لیے اور تدبیروں کے ساتھ آپ ہی آپ یہ تدبیر بھی کی کہ قومی تعلیم کا کچھ انتظام کرے۔ جب بیمار بہت کم زور ہو جاتا ہے تو مرض کو رفع کرنے کی کوششیں بھی کم زور ہی ہوتی ہیں۔ ہماری دوسری کوششوں کی طرح یہ قومی تعلیم کی کوشش بھی بہت کم زور کوشش ہے، بلکہ خود ہماری قوم میں اچھے سمجھ دار آدمیوں کا خاصا بڑا گروہ ہے جو اس کوشش کی ضرورت ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے فائدوں سے بالکل بے خبر ہے۔

یہ لوگ اکثر وہ ہیں جو انگریزی پڑھ لکھ لینے، یا کوئی ہنر سیکھ لینے کا نام تعلیم جانتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی ضرورت اور حیثیت کے مطابق جو اور جتنا لکھنا پڑھنا چاہتا ہے اور جو اور جتنا سیکھنا چاہتا ہے، لکھ پڑھ لیتا اور سیکھ لیتا ہے اگر ان لوگوں کے خیال کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک گروہ یا جماعت یا سماج اپنی جگہ پر کوئی چیز نہیں ہوتی، الگ الگ آدمیوں کے ملنے سے بن جاتی ہے، جیسے پتھروں کا کوئی ڈھیر کہ اس میں اصلی چیز تو الگ الگ پتھر ہیں، یک جا ہونے سے ڈھیر بن گیا ہے۔ سماج میں بھی ان کے خیال میں فرد، اکیلا آدمی، ہی اصلی اور پہلی چیز ہے۔ سماج بس اکیلوں کے مل جانے کا نام ہے۔ ذہنی زندگی کا سرچشمہ فرد یا اکیلا آدمی ہی ہے،

وہی سوچتا ہے، وہی سمجھتا ہے، وہی سب ذہنی چیزیں پیدا کرتا ہے اور سوائے اس کے کہ زندگی کو سہل بنانے کے لیے دوسروں سے کچھ مدد لے لے یا اُن کی کچھ مدد کر دے، خیالات اور ذہن کے لحاظ سے وہ اپنی دنیا آپ ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگ جمہوریت کے لبرل فلسفے کو پڑھ پڑھ کر اور ہرکلیس، پرانتھیس اور رابنن کے ناموں اور کارناموں اور افسانوں سے متاثر ہو ہو کر اکیلے آدمی کو سماجی زندگی کی اصلی حقیقت اور سماج کو ان اکیلوں کا بس ایک ڈھیر یا انبوہ ماننے لگے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلے میں ایک دوسرا خیال بھی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی زیادہ صحیح بھی ہے، یعنی یہ کہ اصلی چیز اور ابتدائی چیز سماج ہے اور اکیلا آدمی، فرد اس کے سہارے اور اسی کے لیے ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ سماج کی حیثیت جسم کی ہے اور اکیلا آدمی یا چھوٹے چھوٹے سماجی گروہ اس جسم کے حصّے ہوتے ہیں۔ جسم کے حصّوں کو جسم سے اور پتھروں کے ڈھیر کو پتھروں سے جو تعلق ہے اس کا فرق ظاہر ہے۔ اس خیال کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں۔ اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ میں آسکتا ہے، مگر پورے انسان کی حیثیت سے، جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے، اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے۔ ذہنی زندگی میں "تو" نہ ہو تو "میں" کا وجود بھی نہ ہو۔ اس لیے ذہنی زندگی کے لیے، جو

اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود لازمی ہے۔ بدن میں ہر حصّے کی کچھ الگ الگ حیثیت بھی ضرور ہوتی ہے، مگر اسی حد تک کہ وہ کل جسم سے وابستہ ہے اور اس کے اندر اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایک حصّے کے کٹ جانے سے جسم میں کمی آجاتی ہے، مگر وہ باقی رہ سکتا ہے، مگر حصّہ جسم سے الگ ہو کر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔ درخت میں ہر ڈالی اور پتّی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے، لیکن ڈالی یا پتّی کے ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا، درخت سے الگ ہو کر ڈالی اور پتّی کے لیے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔

جس طرح کچھ عرصے میں جسم کا ایک ایک ذرّہ بدل جاتا ہے مگر جسم کی زندگی برابر جاری رہتی ہے، جس طرح درختوں کی پتّیاں بدل جاتی ہیں مگر درخت وہی رہتا ہے، اسی طرح سماج کے افراد بھی برابر ختم ہوتے رہتے ہیں مگر سماجی زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح سماج میں بھی دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں، ایک تو بدلتے رہنے کا اور ایک اپنے حال پر قایم رہنے کا۔ ان میں سے کوئی ایک کام بھی رک جائے تو موت کا سامنا ہوتا ہے۔ جو جسم اپنے کو قایم نہیں رکھ سکتا وہ تو فنا ہوتا ہی ہے پر جس میں اپنے کو بدلتے رہنے کی طاقت نہ رہے وہ بھی موت ہی کے گھاٹ اترتا ہے۔ سماج میں افراد کے وجود کی غرض بس یہ ہے کہ اس بقا اور فنا، تحفظ اور تغیر، استقلال اور پرمان کا ذریعہ بنیں، اور انھیں اس قابل بنانے کے لیے سماج کی تدبیر اور اس کا فرض نئی نسلوں کی تعلیم ہے۔

تعلیم دراصل کسی سماج کی اُس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی کرسکیں۔ قومی زندگی میں تعلیم اسی طرح گزرے ہوئے زمانے سے موجودہ زمانے کو ملاتی ہے جیسے اکیلے آدمی کی زندگی میں اس کا حافظہ۔ جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتی وہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتی ہے، اور جس طرح حافظے کے ختم ہو جانے سے اکیلی زندگی کا سلسلہ باقی نہیں رہتا اُسی طرح قومی تعلیم نہ ہونے سے قومی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کی سماج میں ہندستانی سماج کو اپنی علٰحدہ حیثیت قایم رکھنی ہے اور دوسری سماجوں کے مقابلے میں اس کے پاس کچھ ہے جو اسے دوسروں سے الگ کرتا ہے اور وہ اس قابل ہے کہ باقی رہے اور دنیا کی زندگی اس سے مالا مال ہو، تو ہماری سماج کا فرض ہے کہ اپنی تعلیم میں ان خاص چیزوں کا خیال رکھے جنھیں وہ خاص اپنا سمجھتی ہے یا اپنے گزرے ہوئے زمانے کو اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام کرے، اس لیے کہ صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے ہماری تاریخ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی کی بس ایک صورت ہے کہ وہ سماج کے ہر فرد کے دل اور دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو۔

مگر بہت سے روشن خیال لوگ ایسے بھی ہیں جو کہیں گے کہ یہ سب قدامت پسندی کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ قومی روایات تو اکثر قوم کی

راہ میں رکاوٹ ہی ہوتی ہیں اور ماضی کا بوجھ گردن پر اٹھا کر قوم کے لیے آگے چلنا کٹھن ہو جاتا ہے؛ ان خام خیالیوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ اور موجودہ ضرورتوں کا خیال کر کے اور آنے والی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر اپنی نئی نسلوں کو سکھانا پڑھانا چاہیے۔ بس یہی قومی تعلیم ہے اور باقی سب ڈھکوسلے ہیں۔ ایسی باتیں وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو دل سے قوم کی بھلائی چاہتے ہیں اور جن کے دل میں اس بات کی لگن ہے کہ ان کی قوم جلد سے جلد ترقی کرے اور جتنی تیزی سے آگے بڑھ سکتی ہے بڑھے، یعنی خود قوم کی خاطر وہ قومی تعلیم کے اس خیال کو پسند نہیں کرتے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ میں ان لوگوں کی نیک نیتی پر ایک لمحے کے لیے شبہ نہیں کرتا۔ مگر مجھے گمان ہوتا ہے کہ یہ تعلیم کی ماہیت سے واقف نہیں ہیں، ورنہ شاید ایسی بات نہ کہتے۔ تعلیم بس کچھ بول رٹ لینے یا چند باتیں جان جانے کا نام تو نہیں ہے، بلکہ تعلیم اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے۔ تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔ جس طرح انسان کا جسم ایک چھوٹے سے تخم سے شروع ہوتا ہے، پھر مناسب غذا پا کر حرکت اور کام، اور سکون و آرام سے طبیعیات اور کیمیا کے قانونوں کے مطابق کمال کے درجے کو پہنچتا ہے، اسی طرح ذہن کا نشو و نما بھی ذہنی غذا پا کر ذہنی قانونوں کے مطابق ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ ذہن کو یہ غذا کن چیزوں سے پہنچ سکتی ہے اور اس کے اثر کے قانون کیا ہیں۔ تو گزارش یہ ہے

کہ ذہنی غذا ملتی ہے تمدن سے، تمدن کی مادی اور غیر مادی چیزوں سے، مثلاً سماج کے علمی نظام سے، سماج کے فنون سے، سماج کے مذہب سے، سماج کی صنعت سے، سماج کے اخلاق کے اصولوں سے، سماج کے قانون سے، سماج کی رسم و رواج سے، سماج کی بڑی بڑی شخصیتوں کی زندگی سے، سماج میں خاندانی زندگی کے نمونوں سے، سماج کے گاؤں، قصبوں اور شہروں کی زندگی سے، سماج کی حکومت سے، فوج سے، عدالتوں سے، سماج کے مدرسوں سے۔

اب یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ سماج کی تمام مادی اور غیر مادی چیزیں سب ذہنِ انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن اپنے کو ان چیزوں میں ظاہر کرتا ہے، یا یوں کہیے کہ ذہن اپنے کو اپنے سے باہر یہ شکلیں دیتا ہے۔ ان چیزوں میں اس شخصیت کے ذہن کا اثر بھی ہوتا ہے جس نے انھیں بنایا، اس قوم یا نسل کا اثر بھی ہوتا ہے جس سے بنانے والا وابستہ تھا، اس وقت اور جگہ کے حالات کا اثر بھی ہوتا ہے جن میں اس نے یہ چیز بنائی تھی یا ان سب کا اثر یوں کہیے کہ اس چیز میں آکر چھپ رہتا ہے، سو جاتا ہے۔ کوئی نیا ذہن جب انھیں اپنے اندر قبول کرتا ہے تو یہ چھپی ہوئی قوتیں اُبھرتی ہیں، سوئی ہوئی طاقتیں جاگتی ہیں۔ تمدنی چیزوں کی ان سوئی ہوئی قوتوں کو پھر سے کسی انسان کے ذہن میں جگانے سے اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور کسی چیز سے ذہن کی تربیت اسی حد تک سمجھنی چاہیے جس حد تک اس کی سوئی ہوئی قوتیں قبول کرنے والے

کے ذہن میں جاگی ہیں۔ مثلاً اچھے سے اچھے شعر کو کوئی رٹنے جائے، ذہن کی کوئی تربیت نہ ہوگی اگر پڑھنے والے کے ذہن میں پوری طرح یا کچھ نہ کچھ وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو کہنے والے پر طاری تھیں اور جنھیں اس نے اپنے کلام میں گویا لاکر چھپایا تھا، سلایا تھا۔ کوئی شخص اگر دوسروں کی مذہبی زندگی کا حال عمر بھر پڑھتا یا سنتا رہے، لیکن اس کے ذہن میں اس ذکر سے مذہب کی سچی کیفیت بیدار نہ ہو تو عمر بھر کے تعلق کے باوجود اس کے ذہن کی اس مذہبی تذکرے سے کوئی تربیت نہ ہوگی۔ اور یہی حال تمام دوسری تمدنی چیزوں کا ہے۔

تعلیم کے کام سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر ذہن کی تربیت تمدن کی ہر چیز سے نہیں ہوتی۔ جس طرح ہر جسم کو ایک غذا نہیں بھاتی، اس سے کہیں زیادہ ہر ذہن کو بھی ہر ذہنی غذا نہیں بچتی۔ بچہ جس سماج میں پیدا ہوتا ہے اس کے تمدن سے نسلی تعلق کی وجہ سے ہی اس کے ذہن میں کچھ مناسبتیں پیدا ہوجاتی ہیں اور اس لیے خود اپنی سماج کے تمدن کی چیزوں سے اس کے ذہن کی بہتر تربیت ہوسکتی ہے۔ تربیت پا جانے، ترقی کر چکنے کے بعد ذہن دوسری سماجوں کی چیزوں کو بھی اپنا سکتا اور ان سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر شروع میں اپنی موروثی مناسبت کی وجہ سے ایک صورت میں بڑی آسانی اور دوسری میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر وہ شخص جو تعلیم کی صحیح ماہیت کو سمجھتا ہے اس بات پر مجبور ہے کہ بڑی حد تک

ذہن کی تربیت کے لیے خود اس سماج کی تمدنی چیزوں سے کام لے جس سے طالب علم کا تعلق ہے، ورنہ اس کی کوشش کے اکارت جانے کا ڈر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود تعلیم کی ماہیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم قومی تعلیم کا نظام قایم کریں۔

اس لیے باوجودے کہ خود ہماری قوم کے بہت سے سمجھ دار لوگ ابھی اس بات کو صحیح نہیں مانتے، ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ قومی تعلیم کے چند ادارے تو ملک میں قائم ہو چکے ہیں۔ ان اداروں کا، جن میں آپ کے ودّیا پیٹھ کی بڑی اہم حیثیت ہے، فرض یہی نہیں کہ وہ ان طالب علموں کی تعلیم کا انتظام کر دیں۔ جو ان کے یہاں آتے ہیں، یا کچھ عام معلومات کی اور کچھ خاص تحقیقات کی کتابیں شائع کر دیں، بلکہ باوجود وسائل کی کمی اور کام کی دشواریوں کے، جن سے میں بخوبی واقف ہوں، ان اداروں کا بڑا ضروری فرض یہ بھی ہے کہ ان کے کام کرنے والے اور ان کے اُستاد اپنے دیس کی قومی تعلیم کا ایک پورا انتظام بنائیں۔ میں جانتا ہوں یہ نظام ابھی بہت کچھ خیالی ہوگا اور اسے رائج کرنے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ مگر رائج کرنے کے موقعے کہہ کر نہیں آتے۔ پھر جب آتے ہیں تو ایسے حالات میں آتے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کا بہت موقع نہیں ہوتا اور وقت کے وقت جو بن پڑتا ہے کر لیا جاتا ہے اور اس میں اکثر بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں جن کا نقصان صدیوں تک جاری رہتا ہے۔ اس فرض کو ابھی سے انجام دینے کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی ہے کہ ہمارے

ملک میں سیاسی ہی نہیں، علمی اور تعلیمی جماعتوں نے بھی قومی تعلیم کے مسئلے پر بہت کم غور کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہا ہے تو بس یہی کہ موجودہ نظام بہت برا ہے اور اس میں جو ترمیمیں تجویز کی ہیں وہ اکثر بہت جزوی ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے نظام تعلیم میں بس اتنی تبدیلی سے کام نہیں چلے گا کہ اس میں دیسی زبان کے لیے کوئی اچھی جگہ نکل آئے اور تاریخ کی کتابیں بدل دی جائیں۔ ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علیحدہ علیحدہ ہیں۔ قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولے میں ان تفریقوں کو بالکل پس پشت ڈال دیں یا ہر صوبے اور ہر گروہ کو، جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے۔ اگر آپ کے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا سیاسی دانش مندی کا تقاضا ہی نہ سمجھا جائے گا بلکہ خود صحیح تعلیم کے لیے لازمی مانا جائے گا۔

مثال کے طور پر آپ ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلے ہی کو

کے لیے۔ کیا ہندستان کا قومی نظامِ تعلیم ان مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی وحدت اور قوم کی ترقی کے لیے مضر ہو۔ مگر ہمارے ماہرینِ تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کر لیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں، کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قایم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندستانی کی حیثیت سے بھی اس پہ خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرو اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندستانی قومیت کے لیے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں، اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے وہ ہندستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے، ہندستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمے داری ان پر ڈالے، ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مسلمان سیاست کے میدان میں دوسری تمام ہندی آبادی کے پہلو بہ پہلو ہوں گے، جداگانہ اور مشترکہ انتخابات کے جھگڑے ٹنٹے بھی بھلائے جا چکے ہوں گے اور غالباً ملازمتوں کے حصول میں بھی مسلمان ایک خوددار گروہ کی طرح بجائے تحفظ کے مقابلے پر اصرار کرتے ہوں گے، اس وقت بھی وہ یہ ضرور چاہیں گے کہ ان کی تعلیم کے نظام

میں ان کی تمدنی چیزوں کو پورا پورا دخل ہو اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی واقعی ہندوستانی حکومت ان کے اس مطالبے کو پورا کر کے مسلمانوں کی ترقی اور ان کی ترقی سے خود اپنی مضبوطی کا سامان کرے گی۔

بات ذرا دور جا پڑی، میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ہمارے ماہرین تعلیم کو ملک کی مذہبی اور جغرافی جماعتوں کے علحدہ علحدہ یا بالکل ایک سے نظام کے متعلق غور کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ان کا فیصلہ یہی ہو جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تو ایک اور مشکل سوال کا حل انھیں سوچنا پڑے گا۔ یعنی اس طرح اجزا کو تمدنی آزادی دے کر وہ متحدہ قوم اور اس کی ریاست کو کمزور تو نہیں کر دیں گے، اس لیے کہ اگر اجزا کی اس آزادی کے ساتھ کل کے ساتھ محبت کا نہایت مضبوط رشتہ قایم نہ ہوا تو بے شک یہ آزادی کل قوم کے لیے کمزوری اور بعض حالتوں میں ہلاکت کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمارے قومی نظام تعلیم کو اس مرکزی خیال کی ترویج کرنا ہوگی کہ جس طرح افراد کی ذہنی نشو و نما اور شخصیت کی تکمیل کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے کو اپنی سماج کے تمدن سے نشو و نما دیں اور اس کی سیوا کو اپنی ترقی کا ذریعہ جانیں، اس طرح ہماری بڑی ہندوستانی سماج میں جو جماعتیں اور چھوٹی سماجیں ہیں ان میں بھی یہ عقیدہ نہایت پختہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی بحیثیت جماعت اس وقت پوری ترقی کر سکتی ہیں جب کہ بڑی سماج کا اپنے کو خادم جانیں، اس کی بھلائی میں اپنی بھلائی اور اس کی برائی میں اپنی برائی دیکھیں۔ اس عقیدے کا پیدا کرنا اگر نظام سیاسی

کی خوبی پر منحصر ہے تو نظام تعلیم پر بھی بہت کچھ مبنی ہے۔

اور بھی کیا ایسے بے شمار سوال ہیں جن پر ہندستان کے بہترین دماغوں کو غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً اگر ہمارا تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں ہو تو اس وقت بھی کیا مدرسے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قایم ہوا کریں گے اور ان کا مقصد بھی تن درست اچھے سچے" آدمی پیدا کرنے کی جگہ چلتے پھرتے کتب خانے پیدا کرنا ہوگا؟ کیا اس وقت بھی بچوں کی قدرتی صلاحیتوں کا خیال کیے بغیر سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جایا کرے گا اور اس طرح قوم کی ذہنی قوت کو، کہ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، برباد کیا جائے گا؟ یا مختلف صلاحیت والوں کے لیے مختلف قسم کے مدرسے ہوں گے جن میں ابتدائی تعلیم کے بعد بچے" بھیجے جا سکیں گے اور اپنے خاص رجحان ذہنی کے مطابق تعلیم پائیں گے۔ کیا اس وقت بھی مدرسے اور قوم کی زندگی میں اتنا ہی کم تعلق ہوگا جیسا کہ اس وقت ہے یا بچپن ہی سے ایسے موقعے بھی ملا کریں گے جن سے ہر ہندستانی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ قوم کی سیوا کر کے ہی وہ اپنی ترقی کی راہ نکال سکتا ہے؟ کیا اس وقت بھی ہمارے مدرسے خود غرضی اور شخصی مقابلے ہی کے عملی سبق دیا کریں گے اور دوسروں کی خدمت اور مدد کے موقعے ان میں ناپید ہوں گے؟ کیا اس وقت بھی مدرسوں کو بس اس سے سروکار ہوگا کہ علم سکھا دیا لیکن علم کے برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کا کوئی سامان نہ ہوگا؟ کیا اس وقت بھی ہمارا نصاب ایسا ہی

چوں چوں کا مُربّا ہوگا جیسا کہ اب ہے، یعنی کیا اس وقت بھی ہر چیز کو مضمون بنا کر اور نصاب میں شامل کر کے بچّے کے لیے مصیبت اور اس کی تعلیم کے لیے بے اثری کا سامان کیا جائے گا، یا ایک یا تھوڑی سی چیزوں میں اچھی مہارت پیدا کر کے ایسی قابلیت پیدا کر دی جائے گی جس سے وہ دوسری چیزوں کو ضرورت کے وقت خود حاصل کر سکے؟ کیا اس وقت بھی پیشے اور عام تعلیم کو بالکل الگ الگ رکھا جائے گا، یا پیشے کی تعلیم کا ایسا انتظام ہو سکے گا کہ وہی عام تعلیم کی مضبوط بنیاد ثابت ہو؟ غرض یہ اور ان جیسے ان گنت مسائل ہیں جن کا ذکر کر کے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اتنا بھی صرف اس لیے ذکر کیا کہ یہاں ایک بڑے قومی دوّیا پیٹھ کے کارکن جمع ہیں، انھیں اس طرف توجہ دلانے سے شاید اس بات کا موقع نکل سکے کہ ہمارے تعلیمی کام کرنے والے ان مسئلوں پر غور کریں اور اپنی تحقیق کے نتائج کو قومی تعلیم کے کسی ادارے کی طرف سے شائع کر سکیں، تاکہ ہوتے ہوتے سب کے سوچ وچار سے قومی تعلیم کا ایک صحیح پروگرام تو تیار ہو جائے، اور اگر کل نظام کو ناموافق حالات کی وجہ سے رائج نہ کیا جا سکے تو کم سے کم ابتدائی تعلیم کے مسئلے کو طے کرنے کے بعد نمونے کے مدرسے قایم کیے جائیں اور کم سے کم تعلیم کی اس بنیادی منزل کو میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں ہی کے ذریعے درست کرنے کی تدبیر کی جائے۔

کل پتی جی! میں نے آپ کی دعوت اور اس جلسے سے فائدہ

اشارہ کر بعض تعلیمی مسائل کا ذکر کر دیا کہ شاید اس سے اس تحقیق کا دروازہ کھلے جس کی میں نے درخواست کی ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ میں نے یہ ٹھیک بھی کیا یا نہیں۔ اس وقت تو مجھ سے یہ توقع ہوگی کہ میں ان نوجوانوں سے کچھ کہوں گا جو آپ کے ودّیا پیٹھ سے تعلیم ختم کر کے جا رہے ہیں۔ اب آپ کی اجازت سے ان طلبہ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

عزیزو! تم علم کے اس شہر کاشی سے، یہاں کے اس مشہور ودّیا پیٹھ میں اچھے اچھے اور لائق استادوں سے تعلیم پا کر اب دنیا میں قدم رکھتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس دنیا میں، جو ودّیا پیٹھ سے بہت زیادہ سخت اور بے رحم جگہ ہے، تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تجارت اور کاروبار بیوپار یا نوکری سے بہت سی دھن دولت کماؤ اور چین سے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی گزارنے کا سامان کرو۔ اگر ایسا ہے تو خدا تمھارے ارادوں میں برکت دے، مگر مجھے تم سے پھر کچھ بہت کہنا نہیں ہے۔ تم اپنی کامیابی کے لیے خود راہیں تلاش کر لو گے، اگر ٹھیک راستے پر پڑے تو زیادہ تر اپنا فائدہ کرو گے، اگر غلط پر پڑے تو سزا بھگتو گے، مگر دوسروں کا کچھ بہت نقصان نہ ہوگا۔ لیکن چاہے تم دھن دولت کی فکر ہی میں لگ جاؤ، کم سے کم کاشی ودّیا پیٹھ کے سناتک ہو کر تم کبھی اپنی قوم کی راہ میں روک نہ بننا۔ اپنی کامیابی کے لیے بہتیرے لوگ قوم کا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتے تم اس کا دھیان رکھنا کہ کامیابی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے فرائض کو ترک کر کے اور اپنی ساری اچھی خواہشوں کو پیروں تلے روند کر ہی

اس تک پہنچا جائے۔ جو اپنی غرض کے لیے اتنا اندھا ہو جائے کہ اپنے دیس اور قوم کو نقصان پہنچانے سے بھی نہ چوکے، وہ آدمی نہیں جانور ہے۔

اور اگر کاشی ودیا پیٹھ میں پڑھے ہوئے ہونے کی وجہ سے تم اپنی زندگی دیس کی سیوا میں لگانا چاہتے ہو تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔

تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بدنصیب ملک ہے۔ وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے۔ غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجیے، تمھارا اور ہمارا ملک ہے، اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لیے یہ ملک تمھاری ہمتوں کے امتحان، تمھاری قوتوں کے استعمال اور تمھاری محبت کی آزمایش کی جگہ ہے۔

ممکن ہے کہ اپنے چاروں طرف اتنی تباہی، اتنی مصیبت، اتنا ظلم دیکھ کر تم بے صبری میں یہ چاہو، جیسے بہت سے نوجوان چاہنے لگتے ہیں، کہ اس میں بسنے والی سماج ہی کو ختم کر دو اور برباد کر ڈالو، اس لیے کہ اس میں سدھار کی کوئی صورت نہیں تمھیں اختیار ہے، مگر اپنے ایک بھائی کی رائے سن لینے میں بھی کیا نقصان ہے۔ سو میرا خیال یہ ہے کہ

تباہی سے ہمارا کام کچھ سہل نہیں ہوگا۔ تباہی تو پہلے ہی سے کافی موجود ہے۔ قومی زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں پہلے سے تباہی کا دور دورہ نہیں؟ لیکن ہماری بے شمار بیماریوں اور ان گنت مصیبتوں میں سے ایسی بہت کم ہیں کہ ہم یکا یک گرما کر تھوڑی سی دیر میں انھیں ختم کر ڈالیں میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بگاڑنا اتنا نہیں ہے جتنا کہ بنانا ہے۔ ہمارے دیس کو ہماری گردنوں سے اُبلتے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینے کا بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے۔ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی۔ ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، کاری گر کی دھویں سے کالی چھت، اور دیہاتی مدرسے کے پھوس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے۔ سیاسی جھگڑوں، کانفرنس اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قصوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ان میں صدیوں تک کے لیے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا اور ان جگہوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال۔ اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم ہوتی ہے، جلد ہی نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ ہاں، کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے۔

عزیزو! اس نئے ہندستان کے بنانے کے کام میں تم سے جہاں تک بن پڑے ہاتھ بٹانا۔ مگر یاد رہے کہ اگر مزاج میں بے صبری ہے تو تم اس کام کو اچھی طرح نہیں کر سکتے، یہ بڑا دیر طلب کام ہے۔ اگر طبیعت میں جلد بازی ہے تو بھی تم کام بگاڑ دو گے، کہ یہ بڑا اپتا مارنے کا کام ہے۔

اگر جوش میں بہت سا کام کرنے کی عادت ہے اور اس کے بعد ڈھیلے پڑ جاتے ہو تو بھی شاید یہ کٹھن کام تم سے نہ بن پڑے گا، اس لیے کہ اس میں عرصے تک ایک سی محنت اور توجہ درکار ہے۔ اگر ناکامی سے مایوس ہو جاتے ہو تو اس کام کو نہ چھونا کہ اس میں ناکامیاں ضروری ہیں، بہت ناکامیاں اور بار بار ناکامیاں۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے ہر ناکامی اور زیادہ محنت کرنے پر اُبھارتی ہو۔ اس دیس کی سیوا میں قدم قدم پر خود دیس کے لوگ تمھاری مخالفت کریں گے۔ وہ لوگ مخالفت کریں گے جنھیں ہر تبدیلی سے نقصان ہوتا ہے، وہ جو اس وقت چین سے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ شاید حالات بدلے تو وہ اس طرح دوسروں کی محنت کے پھلوں سے اپنی جھولیاں نہ بھر پائیں گے۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ سب تھک جانے والے ہیں، ان سب کا دم پھول جائے گا، تم تازہ دم ہو، جوان ہو۔ تمھارے دل میں اگر شبہہ اور بے اعتمادی ہوگی تو اس کام میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔ اس لیے کہ شبہے سے وہ قوت پیدا نہیں ہوتی جو اس کٹھن کام کے لیے ضروری ہے۔ گندے ہاتھ اور میلے دل لے کر بھی تم اس کو انجام تک نہ پہنچا سکو گے، کہ یہ مقدس اور پاک کام ہے۔ نفرت اور بدگمانی بھی اس کام میں کچھ اچھے ساتھی ثابت نہ ہوں گے کہ تمھاری قومیت کی عمارت کی بنیادیں محبت اور بھروسے کی چٹانوں ہی پر مضبوط بن سکیں گی۔

مختصر یہ کہ تمھارے سامنے، اپنے جوہر دکھانے کا عجیب و غریب

توقع ہے اگر اس موقعے سے کام لینے کے لیے بڑی زبردست اخلاقی قوت کی ضرورت ہے۔ جیسے معمار ہوں گے ویسی ہی عمارت ہوگی۔ اور کام چوں کہ بڑا ہے ایک کی یا تھوڑے سے آدمیوں کی چند دن کی محنت سے پورا نہ ہوگا، دوسروں سے مدد لینا ہوگی اور دوسروں کی مدد کرنا ہوگی۔ تمھاری نسل کے سارے ہندی نوجوان اگر اپنی ساری زندگی اسی ایک دُھن میں کاٹ دیں تب شاید یہ ناؤ پار لگے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم مدد کرنے اور مدد لینے کے قابل ہو گے یا نہیں، اور دوسرے مدد دینے کے لیے آمادہ ہوں گے یا نہیں۔

جب ذات پات، مذہب، زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے۔ جس ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان پانی اور ہندو دودھ ملتا ہے، جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں ملتی ہیں، جہاں بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رائج ہیں، جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے، جہاں بُت پرست اور بُت شکن کو قدرت نے ساتھ ساتھ دُکھ سُکھ کے لیے، ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے لیے یک جا کر رکھا ہے، اس ملک میں نوجوانوں سے ایسے مل کر کام کرنے کی آس ذرا مشکل ہے۔ مگر دل یہی گواہی دیتا ہے کہ تھوڑے دن اور دھکے کھانے کے بعد اس ملک کے نوجوان دیس کی سیوا کے لیے ایک دل ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ میرا عقیدہ ہے کہ ہندستان کی قسمت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے کہ یہاں بالکل مختلف قسم کے انسانی نمونے

ایک دوسرے سے مل کر ایک ایسا آدم تیار کریں جو تہذیب اور تمدن کی ایک نئی تشکیل کر سکے۔ قدرت کے اس تجربے اور قدرت کے اس ارادے میں اُس کی مدد کرنا تمھارا کام ہے اور اس مدد کے لیے اپنے آپ کو اچھا آدمی بنانا اور اپنے دل کو کینہ کپٹ سے خالی کرنا لازمی ہے، قربانیوں کے لیے تیار رہنے کی ضرورت ہے، اپنے ارادے کو مضبوط کرنے اور اپنے نفس کی خواہشوں پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ اگر تم میں اور تمھارے ساتھی نوجوانوں میں یہ صفتیں نہ ہوئیں اور آج ہی تمھیں کسی مہاتما کی کرامت سے سیاسی اور تمدنی زندگی کے اچھے اچھے ادارے بیٹھے بٹھائے مفت میں قدرت کی طرف سے تحفے میں مل گئے تو بھی یاد رکھو کہ یہ تحفہ بے سود ہوگا، یہ ادارے سب کے سب نیچے ہوتے ہوتے اسی سطح پر پہنچ جائیں گے جس پر کہ تمھاری اخلاقی قوت ہوگی اور اُن کی شکل ایسی بگڑ جائے گی کہ مشکل سے انھیں کوئی پہچان بھی سکے گا۔ قوم اپنے اداروں اور خود اپنے مرتبے کو اسی درجے پر قائم رکھ سکتی ہے جس پر وہ خود انھیں اپنے زورِ بازو سے پہنچانے کے قابل ہو۔ اس لیے ہندستان کی بڑائی تمھاری خوبیوں پر منحصر ہے۔ اپنی ذات کی تمام قوتوں کو ترقی دے کر ایک ایسی اخلاقی شخصیت بناؤ جسے بھارت ماتا کے سامنے پیش کرنے جاؤ تو تمھیں خود شرم نہ آئے، اور وہ خوش ہو کر اسے قبول کرلے۔

سیوا کے اس راستے میں جس کا ذکر کر رہا ہوں ظاہر ہے کہ بڑی

دشواریاں ہیں۔ اس لیے ایسے وقت بھی آئیں گے کہ تم تھک کر شل ہو جاؤ گے، بے دم سے ہو جاؤ گے۔ اور تمھارے دل میں یہ شبہہ بھی پیدا ہونے لگے گا کہ یہ جو کچھ کیا کہیں سب بے کار تو نہ تھا۔ اس وقت مادّی اور اخلاقی طور پر آزاد بھارت ماتا کی اس تصویر کی طرف دھیان لگانا جو تمھارے دل میں ہمیشہ رہنی چاہیے یعنی اس دیس کی تصویر پر جس میں سچّائی کی حکومت ہوگی، جس میں سب کے ساتھ انصاف ہوگا، جہاں امیر غریب کا فرق نہ ہوگا بلکہ سب کو اپنی اپنی صلاحیتوں کو پوری پوری ترقی دینے کا موقع ملے گا، جس میں لوگ ایک دوسرے پر بھروسا کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد، جس میں مذہب اس کام میں نہ لایا جائے گا کہ جھوٹی باتیں منوائے اور خود غرضیوں کی آڑ بنے بلکہ زندگی کو سدھارنے اور اس کو بامعنی بنانے کا ذریعہ ہوگا۔ اس تصویر پر نظر ڈالو گے تو تمھاری تھکن دور ہو جائے گی اور تم نئے سرے سے اپنے کام پر لگ جاؤ گے۔ پھر بھی اگر چاروں طرف کمینہ پن اور خود غرضی، مکّاری اور حیلہ بازی، غلامی اور غلامی پر رضامندی پاؤ تو سمجھنا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے، مورچہ سر نہیں ہوا، ابھی جنگ جاری رکھنی ہے اور جب وہ وقت آئے جو سب کو آنا ہے اور اس میدان کو چھوڑنا پڑے تو یہ تسلّی تمھارے لیے بس ہوگی کہ تم نے اپنے بس بھر اس سماج کو آزاد کرنے اور اچھا بنانے میں کوشش کی جس نے تمھیں آدمی بنایا تھا۔ تم چلے جاؤ گے، دوسرے تمھارے کام کو جاری رکھیں گے اس لیے کہ یہ کام کبھی ختم ہونے والا کام نہیں۔ سماج کی آزادی اور سماج

کی صحت ایسی چیزیں نہیں جو بس ایک دفعہ حاصل کرلی جائیں۔ یہ اسی سماج کو ملتی ہیں اور اسی کے پاس رہتی ہیں جس کے سپوت انھیں روزانہ نئے سرے سے حاصل کرسکیں۔

بس، اب رخصت، تمھیں تمھاری تعلیم کی سند مبارک ہو، تم سے بہت سی امیدیں ہیں، خدا کرے کہ مایوس نہ کرو۔

مسلمانوں کی ثانوی تعلیم

(یہ وہ خطبہ ہے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے
اجلاس جوبلی میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو پڑھا گیا)

حضرات!

اس تاریخی تعلیمی انجمن کے محترم کارکنوں کی خدمت میں اس کی پنجاہ سالہ جوبلی پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اس ذرہ نوازی پر جو مجھے اس شعبے کی صدارت کے لیے بلا کر فرمائی گئی ہے دلی شکریہ۔ اپنی بے بضاعتی کے علم کے باوجود اپنی طلبی پر اس لیے خوش ہوں کہ شاید اس سے اس اہم تعلیمی تجربے میں جو میرے ساتھی جامعہ ملیہ میں کر رہے ہیں ان کی اور میری ہمت افزائی مقصود ہے اور شاید اس میں یہ احساس بھی مضمر ہے کہ مسلمانانِ ہند کے تعلیمی نظام میں اس کانفرنس کے نزدیک صرف ایک خاص قسم کی تعلیم گاہوں کے لیے ہی جگہ نہیں بلکہ اُن کی تکمیل ابھی بہت سے تعلیمی تجربوں اور کوششوں کی محتاج ہے۔

اس کانفرنس کو اپنا تعلیمی کام شروع کیے آج ۵۰ سال ہوئے۔

لیکن محض ۵۰ سال کا گزر جانا کوئی خوشی کی بات نہیں، وقت تو جوں توں بیتتا ہی ہے، زمانہ شاد و ناشاد کٹتا ہی ہے۔ اس کے گزر جانے پر خوشی کا موقع ہے نہ رنج کا۔ ہاں خوشی اس پر ہو سکتی ہے کہ جو کام لے کر اٹھے تھے وہ اچھا تھا اور جہاں تک بن پڑا کیا بھی۔ رنج اس پر ہو سکتا ہے کہ جو پیش نظر تھا اس میں خامیاں تھیں یا اس کے پورا کرنے میں کوتاہیاں ہوئیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم دیانت سے اپنے ماضی کا جائزہ لیں تو شاید خوشی اور افسوس دونوں ہی کے مواقع ملیں گے۔ مگر یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ اس وقت کو جب کہ ہم اپنے کام پر ایک مدت کے گزر جانے کی وجہ سے خاص طور پر متوجہ ہو گئے ہیں، یوں ہنس کر یا رو کر گزار دیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے کام کا جائزہ لیں، اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں سے سبق حاصل کریں اور نصف صدی کے تجربے کی روشنی میں آگے کی راہ ڈھونڈیں، یعنی اپنے پچاس سال کے تعلیمی کام پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں۔

کسی تعلیمی کوشش پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کی صحیح ماہیت پیش نظر ہو۔ آپ کی کانفرنس کا نام اور اس کے کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ آپ صحیح طور پر تعلیم کو ایک جماعتی کام سمجھتے ہیں۔ فرد کی تمام قوتوں کی پوری پوری نشو و نما جماعت ہی میں ممکن ہے، خصوصاً ذہنی زندگی، کہ حیاتِ انسانی کی خصوصیت ہے، بلا جماعت کے ممکن ہی نہیں۔ ہر جماعت اپنے وجود کو قایم رکھنے، اپنے ماضی کی تحصیلات

کو محفوظ کرنے اور اُن میں حسب ضرورت تبدیلی اور اضافہ کرنے کا اہتمام اپنی تعلیمی کوششوں ہی سے کرتی ہے، اپنی آنے والی نسلوں کی ذہنی نشو و نما کا کام اپنے موجودہ تمدّن کی چیزوں سے لیتی ہے، نوخیز دماغ ان چیزوں سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کی خفیہ ذہنی قوتیں بیدار ہوتی ہیں اور تربیت پاتی ہیں اور یوں تربیت پاکر اُس متاعِ تمدّنی میں اضافہ کرنے اور اُسے بدلنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کرتی ہیں۔ تعلیم نام ہی اُس کا ہے کہ متعلم کے کُل قوائے جسمانی و ذہنی کی تربیت کرکے اُن میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اُسے تمدّنی زندگی کے کُل شعبوں کا محرم بنا کر اُس میں اپنی استعداد کے مطابق حصّہ لینے کے لیے تیار کیا جائے، لہٰذا تعلیمی نظام کی تشکیل اُسی وقت ممکن ہے کہ جماعت کے سامنے کوئی تمدّنی نصب العین موجود ہو۔

جماعت کے تمدّنی مطمحِ نظر اور اُس کے تعلیمی نظام میں جب یہ چولی دامن کا ساتھ ہے تو پھر تعلیم پر تنقید کی دو راہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ دیکھنا کہ آیا تعلیم اُس تمدّنی مطمحِ نظر کے مطابق ہے یا نہیں اور اُس کی صحیح خدمت کرکے اپنا مخصوص وظیفہ انجام دے رہی ہے یا نہیں، یا اگر وہ خدمت گزاری کا یہ فرض انجام دے رہی ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ خود وہ مطمحِ نظر درست ہے یا نہیں، عارضی طور پر بعض وقتی حالات نے جماعت کا یہ نصب العین بنا دیا ہے یا یہی اُس کا مستقل منتہائے نظر ہے وغیرہ وغیرہ۔ پہلی راہ گویا وسائل پر تنقید ہے اور دوسری

مقاصد پر۔

میں تنقید کی یہ صورت اس وجہ سے اور بھی اختیار کرنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کی تین رسمی تقسیموں یعنی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ میں ثانوی تعلیم کا تعلق تمدنی زندگی اور اس کے مقاصد سے بہت ہی گہرا ہے۔ اس لیے کہ ابتدائی تعلیم تو بچے کو اس عمر میں دی جاتی ہے جب کہ اس کا شعور مقابلۃً بہت محدود ہوتا ہے اور اس کی ترکیب نفسی میں وحدت ہوتی ہے۔ وہ تمدن کی تحلیل مختلف اجزا میں نہیں کرسکتا، نہ اس پر تنقیدی نظر ڈال سکتا ہے۔ وہ تو زیادہ تر اپنے ماحول کی زندگی سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے اس لیے اس منزل میں معلّم کا کام بہت کچھ یہ ہوتا ہے کہ بچے کے لیے ایسا مفید تعلیمی ماحول مہیا کر دے جس میں اس کی جسمانی اور ذہنی قوتیں مجموعی طور پر ابھر سکیں۔ اس راہ میں ایک حد تک معلّم بچے کو انگلی پکڑ کر چلاتا ہے، اور اگرچہ اچھے استاد کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچہ جلد بغیر سہارے کے خود چلنے لگے، پھر بھی رستہ بتانے کی ذمے داری بہت کچھ اسی پر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بچہ عمر کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جب وہ ہر چیز کو جانچنا اور پرکھنا چاہتا ہے، جہاں ایک طرف تو اس میں شعوری تنقید کا مادّہ ابھرتا ہے اور دوسری طرف اس کے قوائے ذہنی میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ وہ تمدنی شعبوں کے تنوع کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کی کثرت کو دیکھ کر پریشان بھی ہوتا ہے اور ان میں وحدت کی تلاش بھی کرتا ہے۔ اس منزل میں خصوصیت سے معلّم کا کام بہت نازک ہوتا ہے،

اب اسے نوجوان متعلم کے سامنے الگ الگ ہر شعبۂ زندگی، مذہب، معاشرت، سیاست وغیرہ کی تفسیر کرنی ہے، ان سب کا باہمی ربط سمجھانا ہے، اُسے ان میں حصّہ لینے کے لیے تیار کرنا ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ نوجوان کی آزادیٔ رائے کو دبا کر اُسے تقلید پر مجبور کرے، بلکہ اس طرح کہ اسے تنقید کا پورا موقع دے، اس کے سارے شک شبہے جہاں تک ہو سکے دور کرے اور جہاں یہ نہ ہو سکے اپنی راہ پر چلنے دے، بشرطیکہ وہ دوسروں کی راہ میں حائل نہ ہو۔

اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی باری آتی ہے جس میں نوجوان متعلّم عام ذہنی تربیت کی منزل سے گزر کر خاص علوم و فنون میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ اگر ثانوی تعلیم صحیح اور مکمل ہو تو اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ بہت سہل ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اُسے ضرور معلّم کی مدد درکار ہوتی ہے، مگر اب پیش قدمی اس کی طرف سے ہوتی ہے اور ذمّے داری بھی اس کی اپنی ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ ثانوی تعلیم کی منزل اس لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں تمدن کی تفسیر اور ترجمانی کا کام جو معلّم کو ہر منزل میں کرنا پڑتا ہے، خاص طور پر مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں معلّم کا کام یہ ہے کہ تمدنی زندگی کو مختلف اجزاء میں تحلیل کر سکے، نوجوان کی تنقیدی قوت کو بھی اُبھارے مگر صحیح راہ سے بھٹکنے بھی نہ دے، اس کی انفرادیت کا احترام بھی کرے اور اُسے جماعتی زندگی سے ربط دینے کی کوشش بھی۔ غرض یہ کہ یوں تو تعلیم کی ہر منزل میں تمدنی نصب العین

کا رکھنا ضروری ہے لیکن ثانوی منزل میں معلم کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اس نصب العین کا واضح تصور اور اس سے دلی لگاؤ رکھتا ہو اور اس کی تفسیر و ترجمانی بخوبی کر سکے۔

نصب العین کے معین ہونے کے بعد ہی نصاب اور طریقۂ تعلیم یعنی ان وسائل و ذرائع کا تعین ممکن ہوتا ہے جن سے وہ نصب العین حاصل کیا جا سکے چناں چہ میں اس وقت مسلمانوں کی موجودہ ثانوی تعلیم کے نصب العین، نصاب اور طریقے ہی پر اجمالی تبصرہ کرنا اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تینوں میں کس حد تک اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس تبصرے کو مجبوراً مسلمانوں کی جدید تعلیمی کوششوں تک محدود رکھوں گا۔ قدیم نظام تعلیم پر بھی اس نقطۂ نظر سے تنقید ایک ضروری کام ہے، لیکن اس کا یہ موقع نہیں۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی جدید تعلیم، جو سرکاری محکمۂ تعلیم کی پابند اور مقلد ہے، کوئی نصب العین نہیں رکھتی۔ مگر میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔ نصب العین کے وجود کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ معین الفاظ میں قلم بند ہو، تعلیم دینے والوں، تعلیم کا انتظام کرنے والوں اور تعلیم دلانے والوں کے ذہن میں اس کا ہونا اور ان کے عمل سے اس کا اظہار کافی ہے۔

ہاں تو یہ نصب العین کیا تھا؟ یہ نصب العین یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد کی جتنی تعداد اپنا پیٹ

پال لے، سرکاری نوکریاں پا پا کر آرام، چین، اور ہاں تھوڑی سی حکومت، کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے کے قابل ہو جائے، اچھا ہے۔ یہ چند افراد اپنی خوش حالی کا معیار جس قدر بڑھا لیں اتنی ہی قوم خوش حال سمجھی جائے، اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں وہ ہر طرح کم کی جائیں مستقبل کے مشتبہ منصوبوں سے حال کی یقینی بہرہ مندیوں میں ہرج نہ ہو اور قومی آخرت کا تصور انفرادی دنیا کے عیش میں خلل نہ ڈالنے پائے، معاشرت بدل جائے، اپنی پرانی معاشرت بُری ہے اور بُری اس لیے ہے کہ ایک با اقبال صاحبِ اقتدار قوم کی معاشرت سے مختلف ہے۔ سیاست سے بے تعلقی رکھی جائے، اس لیے کہ انفرادی ترقی و ترفع کے لیے اپنی جماعت کے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ بہت واضح نہ تھی۔ حکومت کی جو شکل بھی ہو، ہو، بس وہ امن قایم رکھ سکے، محکوموں کے معاملات باہمی میں انصاف کر سکے، نوکریاں دے، چند افراد کو مراتب بلند تک پہنچا سکے کہ اس کا کام نکلے اور ہماری عزت بڑھے۔ مذہب، کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا، چھوٹتا تو کیسے، ضرور قایم رکھا جائے، مگر اس طرح کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو، اور "ترقی" کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ معاملات پر، کہ اہلِ دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اور اُن کی حکمتوں کو زیادہ نہ اُبھارا جائے، چپ چپاتے دوسرے زیادہ "ترقی یافتہ" اہلِ دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے، البتہ عقائد و عبادات پر زبانی زور

رہے اور عملاً رخصت، اور ہاں احساس مذہبیت کے باب میں خود فریبی کے لیے مذہب کے ان حصوں پر جو ماورائے عقل ہیں، عقلی بحثیں اور فلسفہ و حکمت سے تطابق کی کوششیں بھی ہوتی رہیں تو مضائقہ نہیں۔

اس نصب العین کے حصول کے لیے جو نظامِ تعلیم کارآمد ہو سکتا تھا وہ وجود میں آگیا، بہت کچھ دوسروں کی مدد سے، کچھ کچھ اپنی کوشش سے اس نظامِ تعلیم کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا تھا کہ نوجوان لکھنا پڑھنا سیکھ کر سرکاری ملازمت حاصل کریں، اپنا پیٹ پالیں، معاشرت میں مغربی نمونوں کی بھلی بُری نقل اتار سکیں، مذہب کے سرے سے مُنکر تو نہ ہوں مگر اس کی حیات بخش اور زندگی پرور قوت سے محروم رہیں تو ہرج نہیں، سیاست کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رہیں، شخصی مفاد کی خاطر قوم کا نام لینے کی ضرورت پڑی تو یہ ہُنر زمانہ خود سکھا دے گا، یعنی تعلیم عبارت تھی چند مجزدی ہُنر مندیوں سے، اطاعت شعاری کی چند عادتوں سے، انفرادی معاشی خوش حالی کے لیے مسابقت اور مقابلے کے رجحانات سے۔

ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لیے بنائے اور اُن میں اپنی قوت اور وقت اور وسائل کا جو صرف کثیر نصف صدی سے زیادہ سے کیا اُن کو دیکھیے۔ کیا انھوں نے بھی اسی نصب العین کی خدمت انجام نہیں دی؟ اکبر مرحوم نے تعلیم یافتہ آدمی کی زندگی کا جو خلاصہ کیا ہے کہ "بی۔ اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے"، کیا وہ ہمارے

اِن ملّی اداروں کے تعلیم یافتوں پر بھی صادق نہیں آتا؟ ہم کس معنی میں انھیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں؟ کیا اسلام کے پیش نظر جماعت کا یہی تصوّر ہے کہ وہ الگ الگ افراد کا بس ایک اتفاقی اور افادی مجموعہ ہے؟ کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں اور ہزار بار نہیں۔

مگر یہ رونا اپنے تعلیمی نظام کا نہیں، اپنی قومی زندگی کا رونا ہے۔ قومی انتشار و انحطاط نے قوم کے نصب العین ہی کو اتنا پست بنا دیا تھا، پھر تعلیم اپنا دامن کیسے بچاتی؟ لیکن اس وقت، کہ ہم کچھ کچھ اس نصب العین کو غلط سمجھنے لگے ہیں، اگر اس تعلیمی نظام کو ہم نے نہ بدلا تو پھر خود نصب العین کو پست رکھنے کی ذمّے داری بھی تعلیم پر آ پڑے گی۔ شکر ہے کہ آج پھر ہمیں اپنی حقیقت کا کچھ کچھ احساس ہوتا جاتا ہے۔ ہم کچھ کچھ سمجھتے جاتے ہیں کہ قومی زندگی کا وہ انفرادی انتشاری تصوّر ہم نہیں اپنا سکتے جو اس دورِ انحطاط میں ہم پر مسلّط ہو گیا تھا، کہ اس سے تو وجودِ ملّت ہی کے مٹ جانے کا خطرہ ہے۔ ہم پھر اپنی ملّی ہستی کی خالص دینی اور اخلاقی اساس کو دیکھنے اور سمجھنے لگے ہیں۔

ہیں اپنی ملت کے انسانی اور عالمی فرائض کا بھی کچھ کچھ دھیان پھر آنے لگا ہے اور کانوں اور دلوں تک شہداء علی الناس کے مرتبے اور ذمہ داریوں کی یاد دلانے والی آوازیں بار پانے لگی ہیں۔ ہم دین کی خارجی رسمیت کی جگہ اُس کی تخلیقی اور تنویری قوت کی طرف بھی آنکھیں اُٹھانے لگے ہیں، جو ساری زندگی پر حاوی ہو کر اُسے بامقصد اور بامعنی بناتی اور کل زندگی اور کل کائنات میں ہماری حیثیت اور جگہ بتاتی ہے اور ایک ایسی دنیا، جو نسل، وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لیے جہنم بن گئی ہے، پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فراوانی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے جو ایک اُمّی نبی نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملتِ اسلامی اِس تقدیر، اس موقعے اور اس ذمے داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی؟

اس سوال کا جواب آپ کے ذمے ہے۔ اس لیے کہ قوم کے عام نصب العین کو بدلنے کا کام اُس کے مُدبّروں اور مفکّروں، اُس کے ادیبوں اور شاعروں، اُس کے دینی خادموں، اور سیاسی کارکنوں کا بھی ہے، اور اُس کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا بھی۔ اسی لیے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے اس مرکز میں، جہاں اکابرِ ملت اس خاص موقعے پر مجتمع ہیں، میں نے آپ کی توجہ اس طرف منعطف کرانے کی جُرأت کی۔ اگر آپ اپنی حیاتِ قومی کی موجودہ حالت پر مطمئن نہیں ہیں، تو آپ کا فرض ہے کہ قوم کو ان مضر خیالات اور مہلک ذہنی عادات سے نجات دلائیں جن سے

اس کا وجود خطرے میں ہے۔ جوں جوں آپ قومی تخیل میں اس نئے مگر درحاصل پُرانے نصب العین کو جاگزیں کرتے جائیں گے، آپ کا نظامِ تعلیم کیا حیاتِ ملی کے تمام گوشے جنھیں پست مقصدی نے اُجاڑ دیا ہے، نئی اُمنگوں اور نئے ولولوں، نئی کوششوں اور نئی امیدوں، غرض ایک نئی زندگی کی بہار سے لہلہانے لگیں گے۔

اور اگر آپ اپنی قومی زندگی کی موجودہ پستی پر مطمئن ہیں تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آپ کے ثانوی مدرسے ہی کیا آپ کا سارا تعلیمی نظام بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں زرا تبدیلی نہ کیجیے، وہ معاشرت میں اندھی تقلید، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں محکومیت پسندی کے پیدا کرنے، علم میں ذوقِ تحقیق سے اور فنون میں ذوقِ تخلیق سے نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے اور کم زور جسم، بے نور دماغ اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب کارخانے ہیں۔

لیکن باوجود اپنے عام تمدنی اطمینان کے شاید آپ پھر بھی ان مدرسوں کی نوعیت بدلنے پر مجبور ہوں، اس لیے کہ وہ اب اپنی اصلی اور بنیادی غایت کو پورا نہیں کرتے، یعنی روزی نہیں دلا سکتے۔ وہ روزی کا سامان کرتے تھے، سرکاری نوکریاں دلاکر۔ اب اس چراگاہ میں اتنا بڑا گلہ پہنچ چکا ہے کہ یہ اوروں کے لیے تنگ ہے۔ چنانچہ ان مدرسوں کے حامی بھی پریشان ہیں کہ کیا کریں۔ آئے دن نئی نئی تجویزیں بنائی جاتی ہیں۔ ایک منزلِ تعلیم میں مدت کم کی جاتی ہے، ایک میں بڑھائی جاتی

ہے۔ عام ذہنی تعلیم و تربیت پر تنقید اور طعن کا تان ٹوٹنے میں نہیں آتا اور جلد سے جلد تعلیمی نظام میں کسی صنعت یا حرفت یا پیشے کی تعلیم داخل کرنے کا مطالبہ عام ہوتا جاتا ہے۔ میرا گمان ہے کہ یہ سب نئی تجویزیں اسی نصب العین کی خادم ہیں جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ اب محرّری کرکے روٹی نہیں ملتی تو کچھ اور سکھا دینا چاہیے کہ پیٹ پالنے کی صورت نکلے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ یہ ہنر اور دست کاری کو مدرسوں میں داخل کرنے کی تجویزیں سب کو روزی دلانے کا کام جس قدر آسان سمجھتی ہیں وہ اتنا آسان ہے نہیں۔ وہ مدرسوں میں تھوڑا سا ہیر پھیر کرنے سے حل نہ ہوگا۔ جن ملکوں میں صنعتی تعلیم کے ادارے ہر سیکھنے والے کو دولت آفرینی کے بے شمار ڈھنگ سکھانے کو موجود ہیں، وہاں بھی بے کاری سے نجات نہیں۔ کام سیکھے نوجوان کام کرنے کو تیار مارے مارے پھرتے ہیں اور کوئی کام نہیں ملتا۔ اس لیے یہ سمجھ کر اپنے کو دھوکا نہ دیجیے کہ آپ اپنے مدرسوں میں جزوی تبدیلیوں سے اس مسئلے کو حل فرمالیں گے۔ یہ اس سے بہت زیادہ وسیع مسئلہ ہے، یہ ساری قوم کی معاشی تنظیم کا مسئلہ ہے، قوائے دولت آفرین کے بہتر نظم اور تقسیم دولت کے بہتر طریقوں کا مسئلہ ہے، یہ قومی سرمایہ اور قومی محنت کے صحیح تعاون کا مسئلہ ہے، شرح پیدائش اور شرح اموات کو قابو میں لاکر آبادی کو ایک خاص درجے پر قایم رکھنے کا مسئلہ ہے، یہ مدرسوں میں خیاطی اور نجاری کے جاری کردینے یا ان کے اجزا پر ایک رپورٹ شائع کردینے سے

حل نہیں ہوگا۔

کون انکار کرسکتا ہے کہ روٹی کمانا زندگی کے اہم ترین کاموں میں سے نہیں ہے لیکن اس فرض کے پورا کرنے میں آدمی پر اپنی شخصیت، انفرادیت اور آدمیت کا احترام بھی لازم ہے۔ جانور بھی اپنا پیٹ پالنے کے لیے اپنی فطری جبلت اور قدرتی صلاحیت کو ترک نہیں کرتے، غریب انسان کیوں اپنے پیٹ کی خاطر اپنی فطرت اور اپنی قدرتی صلاحیتوں کی بھینٹ چڑھانے پر مجبور ہو؟ عام انسانی معیشت کے لیے بھی یہی اچھا ہے کہ آدمی وہی پیشہ اختیار کرے جس کی خاص صلاحیتیں اس میں ودیعت کی گئی ہیں۔ حسن اتفاق کہ جو آدمیت اور معیشت دونوں کا تقاضا ہے، صحیح تعلیم کی بھی وہی ایک راہ ہے۔ اس لیے کہ تعلیم کا یہی صحیح طریقہ تو ہے کہ جب ثانوی منزل میں طالب علم کے ذہن میں تفریق پیدا ہو تو اس کی ذہنی نشو و نما اُن اشیاءِ تمدنی کے ذریعے کی جائے جو اُس کی مخصوص ذہنی ساخت اور فطری صلاحیتوں کے مطابق اور مناسب ہوں۔ تمدنی اشیاء ذہن معروض ہوتی ہیں، اُن کے اندر اپنے وجود میں لانے والے یا لانے والوں کی ذہنی قوتیں محفوظ ہوتی ہیں۔ جب کوئی دوسرا دماغ ان کو سمجھتا، اپناتا، برتتا ہے تو یہ قوتیں اس دماغ کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ اہلِ علم کے اس مجمع پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ ان ذہنی قوتوں کے ذریعے جو اشیاءِ تمدن میں مضمر ہوتی ہیں، دوسرے ذہنوں کو غذا پہنچانا اور اس سے ان کو تربیت دینا ہی

اصل تعلیم ہے۔ تعلیم نام ہی ذہن معروض کے یوں ذہن موضوع بننے کا سبب ہے۔

اگر یہ نکتہ ان لوگوں کے پیش نظر ہو جو ہمارے نظام تعلیم خصوصاً منزلِ ثانوی کے نظام کو بدلنے کے منصوبوں پر طبع آزمائی فرماتے ہیں تو غالباً وہ محض چند انتظامی تبدیلیوں سے، یا مضامین کے اضافے یا کمی سے، یا مدّتِ تعلیم کی کاٹ چھانٹ سے، یا یونیورسٹی پر نوجوانوں کی یورش کو روکنے کے لیے ایک خاص عمر تک تعلیم دینے کے بعد صنعتی، تجارتی، زراعتی مدرسوں میں اس ریلے کو موڑنے کی تجویزوں سے، ہماری تعلیمی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش نہ کریں اور زیادہ بنیادی غور و فکر کے بعد اصلاح کی شاید زیادہ بنیادی تدابیر سوچیں۔

مثلاً ہماری ابتدائی تعلیم کے سراسر صلاحیت کش نظام کو بدلے بغیر وہ ثانوی تعلیم کو درست کر سکنے کی موہوم امیدیں نہ باندھیں۔ شاید وہ سمجھیں کہ بچپن میں جب کہ فطرت بچّے کو اپنے ماحول سے تجربہ کرنے پر مجبور کرتی ہے، جب گرد و پیش کی چیزوں کو برت کر، بنا کر، بگاڑ کر، توڑ کر، جوڑ کر سمجھنے، اُن سے تعلقات قایم کرنے پر طبیعت اُسے دَم بدَم اکساتی ہے، جب وہ اپنے حواس کی مشق چاہتا ہے، جب وہ اپنے اعضا و جوارح کے استعمال سے اُن کی قوّت کا احساس اپنے اندر قوی کرنا چاہتا ہے یعنی جس عمر میں معمولی بچوں کی بہت بڑی اکثریت کا رجحان طبع عمل اور تجربے کی طرف ہوتا ہے، اس عمر میں ہم ان کو صرف کتابیں دے کر

تنگ و تاریک مکانوں میں قیدیوں کی طرح نہ بٹھائیں اور اُن کو اُن کے فطری ماحول سے جُدا کرنے کی وہ مؤثر تدبیریں نہ کریں جو ہم اپنے ابتدائی مدارس میں کرتے ہیں۔ شاید ہم اصلاح اور تبدیلی کی ایسی تدبیریں نکال سکیں، جن سے ہمارے ان ابتدائی مدرسوں میں سہمے ہوئے پژمردہ چہروں کی جگہ خوش و خرم ہنستے بولتے بچے دکھائی دیں اور ہمارے مدرسوں کی قبرستانوں جیسی خاموشی، بس پہاڑوں کی رٹائی اور سزا پاکر چیخنے کی آوازوں ہی سے نہ ٹوٹے بلکہ اُن کی فضا بچوں کی ہنسی، اُن کے کھیل کے شور اور ان کے کام کی ہماہمی سے معمور ہو تاکہ تقاضائے فطرت کے خلاف محض تعلیم پاکر اُن کی اُبھرتی ہوئی صلاحیتیں پوشیدہ یا پژمردہ نہ ہوجائیں اور ہم ثانوی تعلیم کی منزل میں پہنچنے کے وقت کم و بیش معلوم کرسکیں کہ بچے کی طبیعت کا عام رجحان کیا ہے۔

شاید خالی قیاسی تنگ بندیوں کو چھوڑ کر ہم اپنے تعلیمی ماہروں سے یہ معلوم کرائیں کہ بچے کے شعور میں صلاحیتوں کی تفریق کس عمر میں شروع ہوتی ہے اور اس کی اشکال نفسی کے کون کون سے عام سانچے ہیں تاکہ ابتدائی تعلیم کے ختم پر والدین اور سرپرستوں ہی کو نہیں حکومت کو بھی یہ مشورہ دیا جاسکے کہ ان بچوں میں کس قسم کی خاص صلاحیتوں اور کن خاص رجحانات کا پتا چلتا ہے اور ان کو کس قسم کی ثانوی تعلیم دینی چاہیے۔

اور پھر شاید ان متفرق صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہم کئی قسم کے ثانوی مدارس ساتھ ساتھ قایم کریں جن میں سے کوئی لسانی و تاریخی رجحانِ طبع کی رعایت سے، اُسی کے مطابق تمدنی اشیا سے، اپنے طلبہ کی ذہنی تربیت کا انتظام کرے۔ کوئی عملیاتی، صنعتی صلاحیتوں کو سامنے رکھے، کوئی جمالیاتی و تخلیقی میلانات کو۔ لیکن چونکہ سب صورتوں میں پورے یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو جانا ضروری نہیں کہ طبیعت کا مستقل رجحان کیا ہے، اس لئے ان ثانوی مدارس میں شاید اس بات کا بھی اہتمام کیا جائے، کہ مدرسے کا مخصوص نصاب طالب علم کا سارا وقت نہ لے لے بلکہ اس کے لیے دوسرے مشاغل کا بھی موقع ہو تاکہ دوسری صلاحیتیں بھی، اگر ہوں تو، بے استعمالی سے پژمردہ نہ ہو جائیں اور اگر کسی صلاحیت کے اندازے میں غلطی ہوئی ہے تو اُس کی تصحیح ہو سکے۔

اگر یہ انتظام ہو جائے تو شاید ہم عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کے تضاد پر بے سود بحثوں اور روٹی کمانے اور آدمی بنانے کی جُدا جُدا تعلیموں کے امکان پر لاحاصل طبع آزمائیوں سے بچ جائیں۔ اس لیے کہ جب ثانوی تعلیم کا یہ متنوع نظام اپنے طلبہ کی فطری صلاحیتوں کی رعایت شروع ہی سے رکھے گا تو گویا یہ ثانوی مدرسے درحقیقت عام طور پر تو اس پیشے ہی کے لیے طلبہ کو تیار کریں گے جن کے وہ اہل ہیں۔ تمدن کے اس مخصوص شعبے کی مدد سے، جس کے ساتھ اسے طبعی

مناسبت ہے، ہر طالب علم کی ذہنی نشو و نما کا سامان ہوگا اور یوں تربیت پاکر یہ تمدّن کے دوسرے شعبوں سے بھی متمتع ہو سکے گا۔ شاید ان تعلیم کا انتظام کرنے والوں سے جو اس وقت میرے تخیل کے سامنے ہیں، یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ ثانوی تعلیم تمدّن کے کسی مخصوص جز کی مدد سے ہی طلبہ کو مکمل تمدّن کا محرم بنا سکتی ہے اور پہلے پورا متمدّن انسان بناکر مخصوص صلاحیتوں کی تہذیب نہیں ہوتی، بلکہ مخصوص صلاحیتوں کی تربیت کے ذریعے ہی پورا متمدّن انسان بنتا ہے۔

ذہنی تربیت کے لیے تو کہیں ادب اور لسانیات سے، کہیں فنونِ لطیفہ سے، کہیں صنعت و حکمیات سے، مختلف مدرسے زیادہ کام لیں گے، لیکن غالباً ہماری ثانوی تعلیم کا یہ نیا نظام اپنے طلبہ کے اُفقِ اقدار کو معیّن کرنے اور وسعت دینے کے لیے اُنھیں اپنے نصب العین سے آگاہ کرنے، اُنھیں اپنے ماضی کا رمز شناس بنانے، اور اُن میں مستقبل کے امانت دار ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لیے تمام مدارس میں اپنے دین، اپنی تاریخ اور اپنی زبان کی تعلیم کا خاص انتظام رکھے گا اور انھیں خالی چندہ وصول کرنے یا اعتراضات ٹال سکنے کا وسیلہ نہ بنائے گا۔ وہ ان چیزوں کی تعلیم کے بہتر سے بہتر اسلوب ڈھونڈے گا، ان پر بہتر سے بہتر اُستاد تیار کرنے کا خاص اہتمام کرے گا، اس لیے کہ ثانوی تعلیم کی منزل میں نوجوان اپنے جذبات کی تہذیب کے لیے شخصی مثال کا بہت ہی زیادہ محتاج ہوتا ہے اور اخلاقی و مذہبی

اقدار کی پہچان اور اُن سے لگاؤ کے لیے تو اکثر تاریخی اور اپنے ماحول کی شخصیتوں کا اثر ہی فیصلہ کُن ثابت ہوتا ہے۔

شاید یہ نیا نظام اپنے اُستادوں کا اس سے زیادہ احترام کرے گا جتنا کہ ہم آج کل کرتے ہیں۔ وہ شاید بہت دیکھ بھال کے بعد کسی کو استاد بننے دے گا۔ لیکن جس کو اُستاد بنائے گا اُسے قومی زندگی میں وہ مرتبۂ بلند بھی دے گا جس کا کہ ہر اچھا اُستاد مستحق ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کو، کہ سب سے گراں بہا متاع ملی ہیں، اُن اُستادوں کے سپرد کرے گا تو اُن کی امانت پر بھروسا بھی کرے گا۔ پھر اُن اُستادوں کے پاس قوم کے دل کی کُنجی ہوگی، ان کی شخصیت کے جادو سے اُجاڑ دلوں سے حیاتِ تازہ کے چشمے اُبلیں گے اور متحیّر اور متلاشی نوجوانوں کی شبِ تاریک جستجو، بے شمار راہ نما تاروں سے جگمگا اُٹھے گی۔

شاید اس نئے نظام میں جس کا ذکر اس وقت ایک خواب کے بیان سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا، مگر جس کو سچ کر دکھانا بہت کچھ آپ کے، میرے ہاتھ میں ہے، غالباً تعلیم کا خالص کتابی و نظری طریقہ بھی اس طرح نہ چھایا رہے گا جیسا کہ آج ہے۔ اور مدرسوں میں ہمارے بچے اور نوجوان صرف سُن سُن کر، اور مقررہ کتابیں پڑھ پڑھ کر، اپنے دماغوں کو غیر منہضم معلومات اور واقفیت سے نہ اٹا کریں گے، بلکہ کارگاہوں اور معملوں اور کتب خانوں میں اپنی جستجو، اپنے شوق اور اپنی محنت سے، بے شک شفیق اور لائق اُستادوں کی نگرانی میں، مگر اپنی آزادی اور ذمّے داری

کے پورے احساس کے ساتھ یہ، انکشاف کی لذت سے آشنا ہو سکیں گے۔

لیکن ذہنی تحصیل کے اس انفرادی طریقے کے باوجود شاید یہ ملے جماعتی احساس پیدا کرنے اور جماعتی تعاون کی عادت ڈالنے کے مواقع اور وسائل سے اس طرح تہی دامن نہ ہوں گے جس طرح ہمارے موجودہ مدارس ہیں، اور شاید سیرت کی تربیت کو معلومات کے حصول سے پیچھے رکھنے پر یہ مدرسے کسی حال میں راضی نہ ہوں گے۔ شاید جماعتی احساس اور جماعت کی خدمت کا ولولہ ان مدرسوں میں خالی زبانی تلقین کے ذریعے پیدا نہ کیا جائے گا بلکہ مدرسوں کی زندگی خود باہر کی جماعتی زندگی کا نمونہ ہوگی اور اس کے انتظام و انصرام کا بوجھ زیادہ تر خود طلبہ پر ہوگا۔ ہمارے یہ نئے مدرسے نوجوانوں کی خود مختار آبادیاں ہوں گے جن میں نئی نسل اپنی جماعتی زندگی کی تشکیل کا عملی تجربہ حاصل کرے گی اور ایک آزاد قوم کے نوجوان آزادی کو قایم رکھنے اور برتنے اور ترقی دینے کے لیے تیار ہوں گے۔

ہمارے یہ نئے مدرسے شاید باہر کی دنیا سے بے خبر نہ ہوں گے جیسے کہ آج ہیں اور ثانوی تعلیم کے اداروں میں اُستادوں کو یہ فکر نہ ہوگی کہ اپنے طلبہ کو مدرسے کے کانچ گھر میں چھوئی موئی کی طرح دنیا سے الگ تھلگ رکھیں، بلکہ یہ فکر رہا کرے گی کہ ان نوجوانوں کے لیے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں کہاں کہاں خدمت کے مواقع پیدا کریں اور کس کس طرح انھیں حقیقی زندگی سے دوچار کرنے کی سبیل نکالیں۔

اس لیے کہ ان مدرسوں کے استاد اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ سمجھیں گے کہ ایک طرف طلبہ کی فطری خصوصیات کا پاس رکھ کر ان کے ذہن کی تربیت کریں اور دوسری طرف اس تربیت یافتہ ذہن کو قومی نصب العین کا خادم بنائیں اور اس لیے تیار کریں کہ یہ اپنی جماعت کو انسانیت کی فلاح یعنی مرضیِ الٰہی کے پورا کرنے کا آلہ بنائیں۔

ہمارے یہ مدرسے بے شک اسلامی مدرسے ہوں گے اور اسلامی نصب العین ہی ان کے سامنے ہوگا مگر اس نصب العین کی کوئی تنگ اور غلط تعبیر ان مدرسوں کو فرقہ پروری اور جماعتی خود غرضی کا مرکز نہ بنانے پائے گی۔ اور بے جا تعصب اُن کی نظر سے اس نکتے کو چھپا نہ سکے گا کہ اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں، اگر ہم دُنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مامور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقوے کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے۔ چناں چہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی کہ جب تک اُن کے اِردگرد، اُن کے اپنے گھر میں، غلامی رہے گی

اور افلاس، فلاکت رہے گی اور جہل، بیماریاں رہیں گی اور بدکرداریاں، پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں، یہ چین کی نیند نہ سوئیں گے اور اپنے بس بھر اُن کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے۔ یہ روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے، پر اُن کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین کی اور وطن کی خدمت ہوگی جس سے اُن کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی۔ یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی، کہ کبھی دُنیا اسے جنّت نشان کہتی تھی، پر جو آج بے شمار انسانوں کے لیے دوزخ سے کم نہیں، سیوا کریں گے، اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمٰن و رحیم، رزاق و کریم، حیّ و قیّوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے، بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے، آج اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ اُن کا وجود، محدود نگاہوں کو اس کی شانِ ربوبیت پر ایک دھبّہ سا معلوم ہوتا ہے۔

اور یہی نہیں، یہ اپنی اس بے غرض خدمت سے خود اپنے دیس والوں کو تنگ نظر وطنیت کے عذاب سے بچائیں گے اور اپنے وطن کو دنیا اور انسانیت کا خادم بنائیں گے۔ ہمارا وطن اپنی آبادی کے لیے دوسروں کی بربادی، اپنی ترقی کے لیے [illegible] کا تنزل، اپنی قوت کے لیے دوسروں کی کمزوری، اپنی آزادی کے لیے دوسروں کی غلامی

کے سامان کبھی نہ کرے گا۔ بلکہ جس طرح ہمارا ہر فرد اس نئے نظامِ تعلیم کی مدد سے اپنی تمام مخصوص صلاحیتوں کو نشو و نما دے کر اپنی تربیت یافتہ شخصیت کو جماعتی خدمت کے لیے وقف کرے گا اسی طرح ہمارا وطن اپنی تمام مخصوص قوتوں کو ترقی دے کر دنیا اور انسانیت کی خدمت گزاری کا شرف حاصل کرے گا۔

آپ کہیں گے کہ یہ شخص ہمیں مستقبل کے یہ فرضی افسانے کیوں سُنا رہا ہے۔ معاف کیجیے، اس لیے سُناتا ہوں کہ اس طرف امید کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور ہر جگہ "شاید" اس لیے لگاتا جاتا ہوں کہ اپنے آس پاس ان امیدوں کے بر آنے کے خلاف بھی قرائن پاتا ہوں، لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خود دار آزاد جماعت کی طرح زندہ رہنا ہے تو اُن کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پون سو سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا پچھلی مساعی کی تہ میں جو نصب العین کارفرما تھا اُس پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی اور اگر اس سے اعلیٰ تر نصب العین اُن کے ہاتھ آ گیا، جیسا کہ میرے عقیدے میں ضرور آئے گا، تو پھر اس نصب العین کے حصول کے لیے منجملہ اور چیزوں کے اپنا ایک خاص نظامِ تعلیم بھی مرتب کرنا ہوگا جو کسی دوسرے ناقص نظام کی ناقص تر نقل نہ ہوگا بلکہ ہماری مخصوص تخلیق ہوگا۔ ہمیں ثانوی تعلیم کے نظام سے پہلے عام ابتدائی تعلیم کا نظام بنانا اور جاری کرنا ہوگا، ایک خاص عمر پر بچوں کے رجحانات کی پڑتال کا

انتظام کرنا ہوگا پھر ثانوی تعلیم کے لیے ایک ساتھ مختلف قسم کے، غالباً چار پانچ قسم کے مدارس قایم کرنے ہوں گے، ان مدرسوں میں علاوہ اس شعبۂ تمدّن کے جو ہر مدرسے کا مخصوص ذریعۂ تعلیم ہوگا، اپنے دین، اپنی تاریخ اور اپنی زبان کی تعلیم کا نصاب معیّن کرنے اور اُس کے اُستادوں کی تیاری میں خاص توجہ سے کام لینا ہوگا، ذہنی نشو ونما میں انفرادی طریقے کے ساتھ مدارس کے اندر اور باہر جماعتی خدمت کے مواقع کثرت سے فراہم کرنے ہوں گے، کتابی تدریس کی جگہ عملی اکتشاف کو دینی ہوگی اور خالی واقفیت کی جگہ صحیح ذہنی تربیت اور خالی علم کی جگہ اچھی سیرت کو مرکزِ توجّہ بنانا ہوگا اور اپنے مدرسوں کو قومی زندگی کے ساتھ ربط دینے کی تدبیریں نکالنی ہوں گی۔

میں نے دشوار کاموں کی ایک خاصی لمبی فہرست گنوا دی لیکن یہ صرف ان کاموں کے نام ہیں اُن کی تفسیر و توضیح بہت کچھ چھان بین اور تحقیق کی محتاج ہے۔ پہلے ان میں سے ہر مقصد کا واضح تعین ضروری ہے، اور پھر اس کے وسائل کی تلاش۔ اُن پر آپ کے بہترین دماغوں کی سالہا سال کی کوشش صرف ہوگی۔ یہ سب مشکل کام ہیں، لیکن کرنے کے کام ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی قومی جماعت واقعی انھیں کرنا چاہے تو کرنے والے بھی مل سکتے ہیں۔ میری آرزو ہے کہ یہ کانفرنس اپنے آئندہ لائحۂ عمل میں ان تحقیقی کاموں کی انجام دہی کو شامل کر لے، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ ایسا ہو سکے گا یا نہیں۔ اگر نہ ہو سکا تو آج ہم

تو اس کانفرنس کے پچاس سالہ وجود پر خوشی منا رہے ہیں، ڈر ہے کہ آئندہ پچاس سال بعد خاکم بدہن اس کا ماتم کرنے والے بھی موجود نہ ہوں گے۔ قومی تعلیم کی موجودہ بے راہ روی شاید قوم کے وجود ہی کو ختم کر دے۔ اور پھر یاد انھیں کی کی جاتی ہے جو مشکل کام اپنے سر لیتے ہیں، یا تو طوفان میں طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں یا طوفان سے پہلے اس کے مقابلے کی تیاری۔ ہمارے پچھلے کام کرنے والوں نے جو کام اٹھایا تھا وہ اُس وقت کچھ بہت سہل کام نہ تھا اور باوجودیکہ ہم رفتہ رفتہ اپنے پچھلے پچاس سال کے کام سے غیر مطمئن ہوتے جاتے ہیں اور اُس کا نصب العین آج ہمیں پست نظر آتا ہے، لیکن جن لوگوں نے اس کام کو شروع کیا تھا اُن کے زمانے کی بے حسی کو یاد کیجیے، اور قومی زندگی کے شیرازے کے اس انتشار کا خیال کیجیے جو اُن کی آنکھوں نے دیکھا تھا اور اُن کی ان کوششوں میں بھی جو آج ہمیں زیادہ نہیں جچتیں، قوم کی مخالفت اور حالات کی ناسازگاری کا اندازہ لگائیے تو پتا چلتا ہے کہ بونوں کی ایک جماعت میں یہ لوگ دیو تھے، دیو۔ ان کے کام پر تنقید، مستقبل کی راہ تلاش کرنے کے لیے بے شک ضروری اور مفید ہے اور اس سے ہرگز نہ جھجکنا چاہیے مگر ان شخصیتوں کی عظمت، اُن کے ارادوں کی مضبوطی، اُن کی نیتوں کا خلوص دشمن سے بھی خراجِ تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتا۔ اُن کے کاموں کی تنقید کیجیے اور بن پڑے تو ان سے بہتر کام کیجیے، مگر اُن کی ہمت اور عزم

اور بے غرض خدمت کی یاد پر احسان مندی کے دو پھول ضرور چڑھاتے جائیے ؎

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست !
مشہور گشت زاں کہ در آتش نکو نشست

کاش آج کے بدلے ہوئے حالات میں ہم بھی اسی عزم اور ہمت کا ثبوت دے سکیں اور اپنی قومی زندگی کے تحفظ و ترقی کے لیے ایک نئے نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالنے کا کٹھن مگر ضروری کام شروع کر دیں۔

طبی تعلیم

(یہ وہ خطبہ ہے جو گورنمنٹ طبیہ کالج پٹنہ کے

جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ ۱۹۳۸ء میں پڑھا گیا)

صاحبو!

آپ کا حکم تھا، حاضر ہوں، اور شکر گزار کہ آپ نے یاد فرمایا اور اس معزز مجلس میں خطبہ پڑھنے کی عزت مجھے بخشی۔ مگر سچ عرض کرتا ہوں کہ ابھی تک میں ٹھیک نہیں سمجھا کہ اس گورنمنٹ طبیہ اسکول کے تقسیم اسناد کے موقعے پر میں اس کام کے لیے کیوں بلایا گیا ہوں۔ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تو خیال آیا کہ کہیں میرے نام کے ساتھ جو کچھ دن سے ڈاکٹر کا لفظ لگ گیا ہے اس سے تو دھوکا نہیں ہوا! کبھی کبھی دیہاتوں اور قصبوں میں لوگوں نے مجھ سے نبض دیکھنے اور نسخہ لکھنے کی فرمایش اسی دھوکے میں کی ہے، لیکن ہمارے ملک میں تو یونانی طبیبوں اور ایلوپیتھی کے ڈاکٹروں میں کچھ ایسی بہت بنتی بھی نہیں ہے کہ اس شبہے میں مجھے یہاں بلایا جاتا!

پھر خیال ہوا کہ شاید یہ وجہ ہو کہ ایک تعلیمی ادارے کا جلسہ ہے میں بھی ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہوں، اُستاد اور شاگرد کا تعلق، تعلیم و تدریس کا کام اور اس کی ذمے داریاں کم و بیش ایک ہی سی ہوتی ہیں، چاہے تعلیم گاہ میں معیشت و سیاست اور فلسفہ و ادب کا درس ہوتا ہو یا تشریح و وظائفِ اعضا اور طب و جراحت کا۔ لیکن آج کل ہر فن والا اپنی اپنی کملی میں کچھ ایسا مست رہتا ہے اور تعلیم گاہوں میں بھی کچھ ایسی رقابتیں سی دکھائی دیتی ہیں کہ اس کا بھی پوری طرح یقین نہیں آیا۔

پھر گمان ہوا کہ شاید مجھے امکانی بیماروں کے اس گروہ کا نمائندہ سمجھ کر آپ نے دعوت دی ہو جو آپ کے شریف فن سے استفادہ کرتا ہے اور آپ کے نئے سند پانے والوں کے لیے کم از کم چند سال اور آپ کے بعض وضع دار ساتھیوں کے لیے عمر بھر تختۂ مشق کا کام دیتا ہے۔ لیکن ہمارے دیس میں واقعی اور امکانی بیماروں کی بھی کچھ ایسی کمی نہیں ہے کہ نظرِ انتخاب مجھ تک پہنچتی۔

کسی ایک وجہ پر طبیعت پوری طرح جمی نہیں تو میں نے سوچنا بند کیا اور یہ طے کیا کہ جو تین وجہیں سمجھ میں آئی ہیں اُنھیں کو ٹھیک مان کر آپ کے سامنے کچھ عرض کر دوں۔ پہلی بات یہ کہ جدید مغربی طب اور یونانی طب میں کیا واقعی کوئی بنیادی فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ میری رائے میں طبِ یونانی کی تعلیم میں کن باتوں کا خاص طور پر خیال ہونا چاہیے اور تیسرے یہ کہ ہندستان کا ہر معمولی شہری ان طبیبوں سے

جو آپ کے مدرسے سے پڑھ کر نکلتے ہیں کیا توقع رکھتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جدید مغربی طب اور طبِ یونانی یا اسلامی سے آدمی جتنا ناواقف ہوگا اُتنا ہی اُن کے فرق پر اصرار کرے گا، ان کو جتنی اچھی طرح جانتا ہوگا اتنا ہی اس بات سے بھی آگاہ ہوگا کہ یہ اصل میں ایک، بس فروع میں مختلف ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مغربی طب، طبِ اسلامی کی بیٹی ہے۔ بیٹی نے ماں کی بہت سی چیزیں لے لی ہیں، مگر کچھ چھوٹ بھی گئی ہیں۔ بیٹی بڑے گھر بیاہی ہے، وسائل کی کمی نہیں، اُس نے بہت کچھ نئی دولت حاصل کر لی ہے۔ شروع میں نئی دولت کا کچھ گھمنڈ تھا، کچھ کم عمری کی ناتجربہ کاری، ماں کی جو چیزیں رہ گئی تھیں اُنھیں ذرا حقارت سے دیکھنے لگی تھی، یا اُن کی طرف سے غافل ہو گئی تھی، مگر ہے ذہین اور ہوش مند، اب بھی ان چیزوں کو لے سکتی ہے اور غالباً لے لے گی۔ ماں ذرا گردش میں آگئی، زمانہ بدل گیا، وسائل کی کمی رہی اس لیے جو کچھ اپنے پاس تھا اُس کو بھی سنبھال کر نہ رکھ سکی۔ بدحالی میں کچھ ہمت بھی پست ہو جاتی ہے، نئی چیزوں کو حاصل کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رہتا، کچھ مزاج بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے، اس لیے بیٹی کی چیزوں کی طرف ایک آنکھ دیکھنا بھی اُسے نہ بھاتا تھا۔

مگر بیٹی کی دولت علم کی دولت ہے جس میں کسی کا اجارہ نہیں ہوتا، یہ اسی کو ملتی ہے جو اسے برتنے کو تیار ہو اور اسی کے پاس

رہتی ہے جو اُسے بڑھانے میں کوشاں اور دوسروں کے دینے پر آمادہ ہو۔ ادھر ماں کا مزاج بھی کچھ سنبھل رہا ہے اور زمانے کا رنگ بھی' یہ کیوں نہ ان چیزوں کو اپنا لے گی۔

بے شک اس اپنانے کے بعد بھی دونوں میں جغرافیائی اور معاشرتی ماحول کی وجہ سے کچھ فرق رہے گا، سو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ مثلاً بیٹی کے گھر میں جڑی بوٹیاں کم ہوتی ہیں، اکثر باہر سے لائی ہوتی ہیں، ظاہر ہے وہ اس تدبیر میں رہتی ہے کہ اُن کے جوہر نکالے، تاکہ آسانی سے اِدھر اُدھر بھیج سکے۔ پھر طبیعت بھی ذرا کاروباری ہے۔ سرمایہ داری نظام سے رشتہ ہے۔ اس کی نظر تو معلوم ہی ہے کہ ہر دم ہر چیز سے نفع طلبی پر لگی رہتی ہے۔ دواؤں سے بے شک انسانیت کا دُکھ درد کم کرنا ہے، مگر نفع بھی تو کمانا ہے اور جہاں تک ہو سکے زیادہ نفع۔ بڑے پیمانے پر کاروبار کرنا ہے، کارخانے میں سال کے بارہ مہینے ایک ہی دوا بنتی رہے تو کیا کہنا۔ ایسا کرنے میں قدرت کی نامی چیزوں سے سابقہ ہو تو دقت ہوتی ہے، چناں چہ یوں بھی سرمایہ داری نظام کا رجحان دولت آفرینی کے پورے میدان میں زندہ سے مردہ کی طرف ہے۔ وہ مکان اور پل اور جہازوں میں لکڑی کی جگہ لوہا لگانا چاہتا ہے، سرسوں اور تلی کے تیل کی جگہ مٹی کے تیل سے کام چلاتا ہے، اور پھولوں کی جگہ تارکول میں رنگ و بو کے خزانے ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی نظر اس پر ہے کہ جڑی بوٹیوں سے

نجات ہی ملے اور غیر نباتی اجزا سے کام نکلے تو بہتر ہے نباتی اجزا کو بھی کیمیاوی طریق پر بنایا جا سکے تو اچھا ہے اور یہ نہ ہو سکے تو جڑی بوٹیوں کے جوہر نکال نکال کر اور یوں وزن گھٹا کر اور مال میں یکسانیت پیدا کر کے اُن کی بکری کا رقبہ تو بڑھا ہی لیا جائے۔

ماں کا گھر جڑی بوٹیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان میں سے بہتیری کو تو بیٹی نے ابھی برتا ہی نہیں۔ مگر ماں کے دیس میں ہر سو افلاس ہے۔ یہ مہنگی دوائیں بیچ کر نفع کمانے کی سوچے تو یہاں کے غریب تو دوا کو ترس ترس کر ہی مر جائیں۔ یہ اگر ان کی قدرتی شکل کو بدل کر ٹھکے سیدھے کرنے کی زیادہ فکر نہ کرے تو کیا بُرا ہے۔ پھر دواؤں کو قدرتی شکل میں دینے سے اُن کی بہت سی مضرتوں سے بھی بچاؤ ہو جاتا ہے۔

ماں کا دواؤں کا خزانہ بیٹی سے کہیں بڑا ہے۔ اس کی دواؤں کے اثر صدیوں کے تجربے سے جانچے اور پرکھے جا چکے ہیں، بیٹی کی نئی دواؤں کو برتتے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، یہ بے شک بعض امراض کے لیے تیر بہدف ہیں، مگر ابھی کسے معلوم ہے کہ ان کے استعمال سے کہیں زندگی کی مُدت پر تو اثر نہیں پڑتا یا نظامِ جسم میں ان سے کوئی اور بُرا اثر تو بعد کو پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے بیٹی کو اپنی نئی چیزوں پر بہت اِترانا نہ چاہیے اور ماں کو اُن کا تجربہ کرنے سے زیادہ شرمانا نہ چاہیے۔

غرض یہ کہ ادویہ کے معاملے میں باہمی لین دین کا اور طبِ اسلامی کو

اس میں کچھ دینے کا ہی زیادہ موقع ہے۔ اس کے کام کرنے والوں کا فرض ہے کہ جو بے شمار جڑی بوٹیاں ان کے برتا دے میں ہیں اور جن پر اُن کا ہزاروں سال کا تجربہ ہے ان کے فعل کی جدید حکمی تحقیق کریں اور اُن کے خواص سے طبِ مغربی کو آشنا کریں، اُن کے نئے اسلوب سے کیمیاوی تحقیق کر کے اُن کے افعال و خواص کا صحیح ترتعین کریں۔ طبِ اسلامی ہی نے جدید طب کی بنیاد رکھی۔ جب یورپ سو رہا تھا تو اس نے یونانیوں کے علم کو محفوظ کیا اور اسے ترقی دے کر کہاں سے کہاں پہنچایا اور پھر یورپ والوں کے سپرد کیا۔ آج بھی وہ اپنے خزینۂ ادویہ سے مغربی طب کو بہت کچھ دے سکتی ہے۔ پہلے چند سال میں جو کام اس سلسلے میں ہمارے ملک میں ہوا ہے، خصوصاً آیور ویدک اور یونانی طبّی کالج دہلی کے شعبۂ تحقیق میں ڈاکٹر سلیم الزّماں صاحب صدیقی کی تحقیقات نے اپنی طرف مغربی علما کو متوجّہ کیا ہے، ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ یہ سلسلہ بڑھے گا اور اگر ہم اپنے پُرانے شاگردوں سے بہت کچھ لیں گے تو انھیں کچھ نہ کچھ دے بھی سکیں گے۔

آپ کی طب اور طبِ جدید کی سب سے اہم یکسانیت تو یہ ہے کہ دونوں کی بنیاد مشاہدے پر ہے۔ یونانیوں اور اُن کے بعد کے مسلمانوں نے اس فن کی سب سے بڑی خدمت یہی کی ہے کہ توہمات کے گورکھ دھندے سے نکال کر مشاہدے اور معائنے پر اس کی بنیادیں استوار کیں۔ بقراط اور جالینوس سے کچھ زیادہ ہی رازی اور ابن سینا بھی

طب کے محسن ہیں کہ انھوں نے اس فن کو علمی بنیاد پر قایم کیا کہ پھر اسی بنیاد پر یورپ نے تعمیر کو اور اونچا اٹھایا۔ اس علمی بنیاد کے لیے مرض اور علاج کے مشاہدے کی وسعت از بس ضروری ہے۔ آج طبِّ جدید جس وسیع پیمانے پر مشاہدات جمع کر رہی ہے اس سے آدمی حیرت میں پڑ جاتا ہے لیکن آپ کے پاس بھی ہزاروں سال کے جمع کیے ہوئے مشاہدوں کا خزانہ ہے۔ افسوس کہ اس کا بہت سا حصّہ مشاہدہ کرنے والوں کے ساتھ ضائع ہو گیا، مگر پھر بھی آپ کی خاندانی اور تعلیمی روایات میں بہت کچھ باقی ہے اور آپ کی قدیم کتابوں میں مختلف ملکوں اور مختلف حالتوں میں جمع کیے ہوئے مشاہدوں کا اتنا ذخیرہ ہے کہ آج پھر دنیا کے سامنے لایا جائے تو شاید فنِ طب کی مزید ترقی میں اور اس کے تحقیق کرنے والوں کو نئی راہیں سجھانے میں بڑی مدد دے سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان مشاہدوں کی ایسی توجیہوں پر اڑنے کی جگہ جن کو بعد کے واضح تر مشاہدوں نے باطل ثابت کر دیا ہے خود ان مشاہدوں کو لیں، اور ان پر علمی کام کریں۔ بیماریوں کی پہچان اور ان کے علاج کے متعلق آپ کے اساتذہ کی کتابوں میں جو تفصیلیں درج ہیں (جیسے ابو بکر محمدؒ زکریا رازی کی 'حاوی' میں جس کے قلمی نسخے آج یورپ کے کوئی نصف درجن کتب خانوں میں منتشر پڑے ہیں اور کسی محنتی محقق کی کاوش کے منتظر ہیں) ان کے مطالعے سے آج بھی مفید نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ یا آپ کا نباضی کا فن ہے اس میں

ہزاروں برس کے مشاہدوں کا نچوڑ ہے اور ان چیزوں کو مغرب کے ماہرین امراضِ قلب آج پھر سے معلوم کر رہے ہیں۔ جس چیز پر آج سے کچھ برس پہلے وہ اور ان سے زیادہ اُن کے جاہل چیلے ہنسا کرتے تھے، اس کی باریکیوں کا پتا چلانے پر آج خود نت نئے آلات کی مدد سے متوجہ ہیں۔ آپ کا فن اپنے ہزاروں سال کے مشاہدے کی مدد سے اس نئی تحقیق کو کامیابی کی بہت سی راہیں بتا سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر فن پر اُس کے معاشرتی ماحول کا اثر بھی ہوتا ہے۔ آپ کی طب، جس زمانے میں بڑھی تھی وہ فرد سے زیادہ جماعت کا اور جُزو سے زیادہ کُل کی اہمیت کا زمانہ تھا۔ مغربی طب کی ترقی اس عہد میں ہوئی جب یورپ جزو پرستی کے دور سے گزر رہا تھا۔ جمہوری سیاست، لبرل فلسفہ، استقرائی سائنس سب کا تقاضا یہ تھا کہ توجہ کُل کی طرف سے ہٹ کر جزو کی طرف آئے۔ اس رجحان کے پیدا کرنے میں بھی ضرور عربی اور اسلامی اثرات ذہنی کا کچھ حصّہ تھا اور یہ چیز حدودِ مناسب میں رہے بھی درست، مگر زیادتی تو ہر چیز کی بُری ہوتی ہے۔ ہوتے ہوتے ہوا یہ کہ جزو پر توجہ دینے نے کُل کی طرف سے غافل کر دیا۔ اور لوگ درختوں کے دیکھنے میں ایسے محو ہوئے کہ جنگل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا طب میں بھی یہی ہوا۔ امراض کی جزوی تحقیق اور مخصوص امراض کے ماہرین کے الگ الگ کام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریض کی پوری شخصیت پر سے نظر ہٹ گئی۔ آپ کی طب کا مسلک اس باب میں اور تھا، افلاطون کے ایک مشہور

مکالمے میں سقراط نے پوچھا ہے "کیا تم خیال کرتے ہو کہ کل کی ماہیت کا پتا لگائے بغیر تم روح کی ماہیت کو سمجھ سکتے ہو؟" توفیدراس نے جواب دیا ہے کہ "جی، بقراط کا قول تو یہ ہے کہ روح تو روح ہے، جسم کی ماہیت بھی بہ حیثیت کُل ہی کے سمجھی جا سکتی ہے۔"

آج مغربی زندگی کے سانچے پھر بدل رہے ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں اس وقت جزو سے کُل کی طرف رُخ ہے، اس لیے میرا تو خیال ہے کہ مغربی طب بھی، جو ایک صحیح راہ پر ذرا نامناسب حد تک بڑھ گئی تھی، وہاں سے لوٹے گی اور آپ کی طب کی یہ خصوصیت کہ مریض کی پوری شخصیت کے پیشِ نظر اُس کے جزوی دکھ درد کا درماں تلاش کرتی تھی، پھر جدید طب کی مشق میں بھی واپس آئے گی اور کیا عجب ہے کہ مزاجوں اور طبیعتوں کا وہ نظریہ جس سے آپ تشخیص مرض اور تجویز علاج میں کیا کچھ مدد نہیں لیتے، پھر جدید طب میں زیادہ مفصل اور مدلل اور واضح ہو کر داخل ہو۔

لیکن جہاں آپ کی طرف سے جدید مغربی طب پر یہ اثر پڑ سکتے ہیں وہاں اس کی بھی ضرورت ہے کہ جدید طب نے جن پرانی غلطیوں کو رد کر دیا ہے، جو نئی باتیں معلوم کی ہیں، اُنھیں آپ کھلے دل سے قبول کریں۔ تحقیق کے جدید طریقوں کو اپنائیں کہ آپ ہی کے پرانے مگر بھلائے ہوئے طریقے ہیں، نئی علمی بول چال کے اسلوب سیکھیں کہ اپنی سمجھائیں اور دوسرے کی سمجھ سکیں۔ اصطلاحوں کے اختلافات ہی سے

نہ جانے کتنے پردے پڑ گئے ہیں، ایک ہی بات کہتے ہیں اور ایک دوسرے کو مخالف سمجھتے رہتے ہیں۔ آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ دیجیے اور اُن کے پاس جو ہے وہ لیجیے۔ علم اس کی مِلک ہوتا ہے جو اسے ڈھونڈتا ہے اور اسے برتتا ہے۔ اپنی پُرانی کتابوں کو کھنگال ڈالیے، ان سے ابھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ اسے سیکھیے اور اوروں کو سکھائیے دوسروں کی کتابوں میں جو ہے وہ اپنی زبان میں منتقل کیجیے۔ آپ کے اجداد اگر اسی پر اکتفا کرتے جو ان کے پاس تھا تو آپ کا فن کہاں ہوتا؟ انھوں نے تو حنین ابن اسحٰق اور عیسیٰ ابن یحییٰ اور ثابت اور ابراہیم کے ساتھ مترجموں کی فوجیں لگا دی تھیں اور جہاں سے جو کچھ ملا اپنی زبان میں منتقل کرا لیا تھا اور پھر اسی کی بُنیاد پر آگے کام بڑھایا تھا۔ آج یونانیوں کی بہت سی تحقیقاتیں دنیا کو عربی ترجموں ہی کے ذریعے مل سکتی ہیں۔ آپ کے فن کے بادا آدم جالینوس کی تشریح آج یونانی میں نایاب ہے اور عربی ترجمے ہی کے ذریعے دنیا تک پہنچی ہے۔ دنیا کے انقلابوں کو کون پہلے سے دیکھ سکتا ہے، کیا ہوا، شاید جدید مغربی طب کی چیزیں آنے والی نسلوں کو ہندُستانی ترجموں سے پہنچیں۔ لیکن ایسا تب ہی ہو سکتا ہے کہ آپ میں علم کے لیے وہی لگن ہو جو آپ کے بزرگوں کو تھی اور سیکھنے کا وہی ولولہ ہو جو ہر جگہ اور ہر شخص سے اچھی بات سیکھنے پر آمادہ رکھتا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں دونوں گروہوں میں تاریخی نظر اور بے تعصبی کی ضرورت ہے۔ یہ پیدا ہو جائیں تو دونوں ایک دوسرے

سے فائدہ اُٹھائیں اور طبّیہ اسکول میں تقسیمِ اسناد کے موقعے پر کسی ڈاکٹر کو اور میڈیکل کالج کے جلسے میں کسی یونانی طبیب کو بلانے میں دونوں تامّل نہ فرمائیں۔

میں نے اوپر جن صفات کا ذِکر کیا ہے یعنی اپنے اوپر بھروسا اور دوسرے سے سیکھنے پر آمادگی، وسعتِ نظر اور بے تعصبی، اُن کے پیدا کرنے کا کام بہت کچھ طب کے تعلیمی اداروں کے ذمّے ہے۔ اجازت دیجیے کہ طبِ یونانی کی تعلیم کے متعلق چند خیال مختصر طور پر پیش کروں۔ سو پہلی بات جس کا کہنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ ان تعلیم گاہوں کو ہردم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ طب ایک فن ہے، علم پر مبنی۔ اس کے تعلیم پانے والے کو اسے علم کی طرح جاننا اور فن کی طرح سیکھنا چاہیے۔ علم سچائی کا پتا چلانا چاہتا ہے، دوسرے کے کہے پر شبہہ کرتا ہے، پھر اپنے مشاہدے اور فکر سے اس شبہے کا حل ڈھونڈتا ہے اور جب اُسے پا جاتا ہے تب ہی مطمئن ہوتا ہے۔ فن کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے صحیح ذریعوں کی تلاش کرتا اور انھیں برتنے کے طریقے نکالتا ہے۔ فن بتاتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، علم بتاتا ہے کہ کیوں ایسا ہوا۔ طب میں علم کے بغیر فن اندھا رہتا ہے اور فن کے بغیر علم بے سود۔ اچھی طبّی تعلیم گاہ کا کام یہ ہے کہ طب کا علم اور طب کا فن دونوں سکھائے۔

یہ ضرورت اس وجہ سے اور بھی اہم ہے کہ اس فن کے بے علم

دعوے داروں کی دُنیا میں کبھی کمی نہیں رہی۔ قدیم الآیام سے ہر شخص نے اس میں طبع آزمائی کی ہے اور آج تک تقریباً ہر مریض اور ہر تیمار دار نسخوں میں تبدیلی کی فرمایش کرنا اور تشخیص میں مشورہ دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ کسی رئیس کا قصّہ ہے کہ انھیں ایک دفعہ یہ خیال آیا کہ آؤ معلوم کریں کہ شہر میں کون سے پیشے والے سب سے زیادہ ہیں۔ ان دنوں اعداد و شمار مرتّب ہو کر شائع نہیں ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے پوچھا۔ کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ۔ دربار کے مسخرے نے کہا "حضور طبیب سب سے زیادہ ہیں۔" طبیب اس شہر میں کچھ ایسے بہت تھے نہیں، سب نے اس کی تردید کی تو مسخرے نے کہا "بہت اچھا۔ زندگی ہے تو کسی دن اپنے قول کا ثبوت پیش کردوں گا۔" دوسرے ہی دن صبح مسخرے نے اپنے چہرے پر اوپر سے نیچے ایک چوڑی سی پٹّی لپیٹی اور گھر سے نکلا، پہلا ہی شخص جو اسے راہ میں ملا اُس نے پوچھا "کیوں بھائی کیا ہوا؟" مسخرے نے کہا "ڈاڑھ میں درد ہے، رات بھر پلک سے پلک نہیں لگی۔" جواب ملا "بھائی۔ بڑی ہی اچھی دوا ہے اس کی ہزار بار کی مجرب۔ فلاں فلاں چیز لو اور پیس کر مل لو۔ بھلا درد کھڑا تو رہ جائے۔" مسخرے نے ایک پرزے پر کچھ لکھا جیسے دوا کا نام لکھ رہا ہو مگر لکھا تھا طبیب صاحب کا نام۔ چند قدم ہی آگے بڑھا ہوگا، ایک اور بزرگ ملے "ارے بھائی یہ کیا؟" مسخرے نے پھر وہی روداد سنائی۔ جواب ملا "بھائی! اس کی تو بڑی اچھی

دوا میرے پاس ہے، ایک سادھو نے بخشی تھی، فلاں فلاں چیز لے کر پانی میں جوش دو اور اس سے غرارہ کر لو۔ ایک ہی دفعہ میں درد غائب ہو جائے گا۔" مسخرے نے ان کا نام بھی ٹانک لیا۔ راستے بھر قدم قدم پر کوئی صاحب ملتے اور کوئی نہ کوئی مجرب نسخہ تجویز فرماتے اور یہ سب طبیبوں کا نام درج کرتا جاتا۔ ہوتے ہوتے رئیس صاحب کے محل پر پہنچا، نوکروں، ساتھیوں میں جو ملتا ہے یہی پوچھتا ہے کہ "کیا ہوا؟" اور جھٹ ایک مجرب دوا بتا دیتا ہے۔ اس نے ان سب کے نام بھی لکھ لیے۔ اتنے میں رئیس صاحب کا سامنا ہو گیا، بولے "ہاں، یہ کیا؟" کہا "حضور، ڈاڑھ میں سخت درد ہے۔ رات بھر سویا نہیں، جی چاہتا ہے کہ دیوار سے سر دے ماروں۔" "نہیں میاں" رئیس صاحب بولے "یہ بھی کوئی بیماری ہے، اس میں کیا رکھا ہے۔ اٹھانا تو وہ میری لال بیاض، اس کے تو دسیوں مجرب نسخے ہیں۔ لو، یہ دوائیں منگالو، سب کو پیس کر پوٹلی بنالو اور گرم کر کے ذرا سینک لو، بس درد غائب۔" مسخرے نے رئیس صاحب کا نام بھی درج کر لیا۔ پٹی کھول دی اور دست بستہ گزارش کی کہ "حضور جب میں نے کل یہ عرض کیا تھا کہ طب کا پیشہ سب سے زیادہ عام ہے تو خود مجھے بھی خبر نہ تھی کہ اتنے طبیب ہوں گے۔ گھر سے یہاں تک آتے آتے کوئی سو سے اوپر تو طبیب مجھے مل گئے۔ فہرست ملاحظہ ہو۔ حضور کا نام بھی طبیبانِ حاذق کی اس فہرست میں درج ہے۔"

یہ صورتِ حال کچھ ہمارے ہی ملک سے مخصوص نہیں، نہ اَن پڑھ

جاہلوں تک محدود ہے، مثلاً انگلستان کے اہلِ حکمت کی سب سے معروف سبھا، رائل سوسائٹی کے قائم کرنے والے، کیمیائے تحلیلی کے بانی، گیسوں کے پھیلاؤ کے متعلق اس مشہور قانون کے دریافت کرنے والے جو آج تک اُن کے نام سے موسوم ہے یعنی رابرٹ بوائل (Robert Boyle) نے بھی ابھی ڈھائی سو برس بھی نہیں ہوئے ایسے ہی "مجرب" نسخوں کا ایک مجموعہ شائع کرایا تھا جو بہت سی بے کار اور بہت سی مضر دواؤں سے پُر تھا۔ اسے بھی کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا ہے کہ انگلستان کے ایک مشہور امیر Sir Kenelme Digby نے ایک سفوف "ہمدردی" ایجاد فرمایا تھا کہ کسی مجروح شخص کے خون آلود کپڑوں کو اس سفوف کے محلول میں تر کرنے سے زخم اچھے ہو جاتے تھے! اس سفوف کو ہزاروں زخمیوں نے استعمال کیا ہوگا اور سینکڑوں راست باز انگریزوں کے صداقت نامے اس کی تاثیر کی شہادت دیتے ہیں، خون آلود کپڑوں کو محلول میں بھگو دیا اور بس درد گھٹنے لگا، زخم مندمل ہونا شروع ہو گیا! خود ہمارے ملک میں ہمارے ہی زمانے میں ایسے "تقدّس مآب" علاج کرنے والے گزر چکے ہیں جن کی تصویر کو صبح سویرے دیکھنے سے ہزاروں بیمار اچھے ہو جاتے تھے! سینکڑوں نیک دل لوگوں کی تصدیقیں موجود ہیں!!

میں نے اس خطرے کا ذکر اس لیے ذرا تفصیل سے کیا ہے کہ اگر آپ کی تعلیم اس کا علاج نہ کر سکی تو گویا اس نے اپنا بنیادی کام انجام

نہیں دیا۔ آپ کا فن مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہے، لیکن بقول بقراط مشاہدہ بڑے دھوکے دیتا ہے اور صحیح حکم لگانا بڑا دشوار ہے۔" آپ کی تعلیم کا پہلا کام یہ ہے کہ صحیح مشاہدے کی صلاحیت پیدا کرے، اس کے دھوکوں سے بچنے اور صحیح مشاہدوں سے صحیح نتیجوں پر پہنچنے کی مشق کرائے۔ ٹھیک دیکھ سکنا اور منطقی طور پر سوچ سکنا سکھا دیجیے تو آپ نے تعلیم کا تین چوتھائی کام کر دیا۔ اوپر جن لوگوں کا ذکر ہوا یہ سب اراد سے سے دھوکا نہ دیتے ہوں گے اور جو ان کی بات مانتے تھے وہ سب بالکل گدھے نہ ہوں گے۔ بات صرف اتنی ہے کہ منطقی طور پر سوچنے کی صفت آدمیوں میں عام نہیں ہوتی، تعلیم بھی اکثر اس ضروری کام کی طرف سے غفلت برتتی ہے اور سمجھتی ہے کہ کچھ کتابیں رٹا دینے، کچھ نسخے لکھا دینے، کچھ عجیب عجیب نام یاد کرا دینے سے آدمی تعلیم یافتہ ہو جاتا ہے، حالاں کہ تعلیم کا کام ہے ذہن کی نشوونما اور اس میں ترتیب اور مشاہدے کے دھوکوں سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔ دھوکے بازی اور ضعیف الاعتقادی کی جو مثالیں اوپر بیان ہوئیں ان میں بس یہی غلطی تو عام طور پر ہوتی ہے کہ اگر کوئی چیز کسی دوسری چیز کے بعد ظاہر ہو تو لوگ پہلی کو علت اور دوسری کو معلول سمجھ بیٹھتے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ یہ اس کے بعد ہوا ہے اس لیے اس کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ حالاں کہ منطقی طور پر سوچنے والا ہمیشہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا یہی نتیجہ بغیر پہلے والی بات کے بھی رونما ہوتا یا نہیں۔ یا یہ کہ کہیں یہ نتیجہ باوجود اس پہلی بات کے تو پیدا نہیں ہوا۔

ان سوالوں کے جواب کے لیے وہ اپنے مشاہدے کو تجربے سے جانچتا ہے۔ کچھ حالات کو بدلتا ہے، کچھ کو ان کے حال پر رہنے دیتا ہے اور یوں رفتہ رفتہ علّت اور معلول کے تعلق کا پتا چلاتا ہے۔

اگر آپ اپنے شاگردوں کو طب کی ساری کتابیں حفظ کرادیں لیکن ان میں مشاہدے اور مشاہدے کی جانچ کی عادت راسخ نہ کریں تو آپ طب کی تعلیم نہیں دیتے، عطائی بناتے ہیں۔ آپ کے فن میں اس کا خطرہ اور زیادہ اس وجہ سے ہے کہ یہ تمام تر مشاہدے پر مبنی ہے۔ اگر علم کا سہارا اسے نہ ہو تو یہ رفتہ رفتہ فنِ طب کے درجے سے عطائی کے درجے پر، اور عطائی سے خطرۂ جان کے منصب پر پہنچ سکتا ہے۔ اور ہمارے ملک میں طبّی تعلیم کے انتظامات کی خرابی نے اس فن کو ان پست تر منازل تک پہنچانے میں کیا کمی کی ہے! آپ کا فرض ہے کہ اسے اس کی علمی بلندی سے گرنے نہ دیں بلکہ بلند تر مرتبے پر اسے پہنچائیں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ بجائے اس کے کہ سب کچھ تھوڑا تھوڑا بتایا جائے چند چیزیں اچھی طرح سکھائی جائیں۔ نصاب کو ہر طب و یابس سے بھر دینے کی جگہ اس کا اہتمام ہو کہ بنیادی علوم، کیمیا، تشریح اور وظائف الاعضاء سے طلباء کو گہری واقفیت ہو جائے، محض دفع الوقتی اور امتحان پاس کرنے کے لیے نہیں بلکہ حقیقی طور پر ان کے بنیادی اصولوں سے طلباء روشناس ہو جائیں، ان علوم میں جس طرح ترقی ہوتی ہے اس کے گُر کو سمجھ لیں اور تجربہ گاہوں اور جراحت خانوں

میں ان طریقوں کو برت بھی لیں جن پر چل کر فن کے اساتذہ نے کمال حاصل کیا ہے، تو بڑی بات ہو۔ ان راہوں پر چلنے کا وقت تو ساری عمر ملتا رہے گا لیکن ان پر چلنے کی صلاحیت اور خواہش طالب علمی کے زمانے میں ضرور پیدا کر دینی چاہیے۔ یہ علم وسیع نہ ہو تو نہ ہو مگر گہرا ہو کر اس کی گہرائی آپ کے طلباء کو عطائیت کے اُتھلے پن سے بچائے گی۔

اور سب سے زیادہ یہ کہ آپ کو کتابوں کی تعلیم سے کہیں زیادہ توجہ عملی تعلیم کی طرف کرنی چاہیے۔ مشاہدے اور تجربے کی مشق کا موقع بھی طالب علم کو شفا خانے میں ملے گا اور عملی طور پر علاج اور دیکھ بھال کرنے کا بھی۔ یہیں اس کے علم کی بنیادیں بھی استوار ہوں گی اور فن کی مہارت بھی حاصل ہو سکے گی۔ آج مغربی طِب کی تعلیم گاہوں کے ساتھ جیسے تجربہ گاہوں اور شفا خانوں کا اہتمام ہوتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس سے کم درجے پر اسلامی طِب کے اداروں کے ساتھ ہو۔ اسلامی طِب نے جن دنوں یونانیوں کے علم کو چار چاند لگائے تھے تو اس کی تعلیم کے لیے بھی یہی ساز و سامان ہوتا تھا۔ آج سے ہزار سال پہلے کے اس شفا خانے کا حال معلوم کیجیے جو احمد بن طولون نے قاہرہ میں قایم کیا تھا، بیمارستان الکبیر المنصوری کا حال پڑھیے، جو ۱۲۸۴ء میں وہیں قایم ہوا، اس کے مصارف کے تخمینے دیکھیے، ہر مرض کے مریضوں کے لیے الگ الگ رہنے کے انتظامات کا ذکر دیکھیے، بیماروں کے کھانے کی تیاری کے اہتماموں کی تفصیل سنیے، شفا خانے کے ساتھ تعلیم کے لیے درس کے کمروں کا

اہتمام دیکھیے، دواؤں کے علیحدہ خزینوں کی تفصیلات معلوم کیجیے، تو خیال ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے کسی بہت بڑے مغربی شفاخانے کا حال سامنے ہے۔ پھر تیرھویں صدی کے وسط میں تبریز میں رشید الدین فضل اللہ کے ربع رشیدی کی سیر کیجیے، اس کے خطوں میں تمام دنیا سے اچھی سے اچھی دواؤں کی بڑی مقداروں کے آرڈر دیکھیے اور اس کی زیر نگرانی تعلیم طِب کی تفصیلات معلوم کیجیے، تو خیال ہوتا ہے کہ صحیح تعلیم دینے کا اہتمام آج بھی کہیں اس سے بہتر نہیں ہے۔ اس ایک طبیب وزیر نے ہندستان، مصر، شام اور چین سے پچاس باکمال طبیب جمع کر لیے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے فن میں وحید عصر ہے، ہر ایک کے ساتھ صرف دس دس چُنے ہوئے ہونہار طالب علم مقرر ہیں۔ ان کے ذمے شفاخانے میں متعیّن فرائض ہیں۔ یہ بیماروں کی حالت کا مطالعہ کرتے ہیں، اس کے نوٹ رکھتے ہیں اور اپنے اُستادوں سے ان کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ شفاخانے کے کاموں کے لیے ہر طرح کے ماہر و مددگار رہیں، جن کے ساتھ عملی کام سیکھنے کے لیے پانچ پانچ مددگار طالب علموں میں سے ہیں۔ ان طلبہ سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انھیں صحیح مشاہدے کا ڈھب آجائے گا اور مشاہدے سے صحیح نتیجے نکالنے کا سلیقہ سیکھ لیں گے، ان سے امید ہو سکتی ہے کہ یہ مشاہدے کے دھوکوں سے بچ سکیں گے اور اپنے فن کے مرتبے کو اپنی محنت اور تجربے سے بلند کریں گے۔ میری رائے میں تو آپ کے فن کی تعلیم میں کامیابی کا گُر بس

یہی ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں بنیادی چیزیں سکھائیے، فروعات کو چھوڑ دیجئے، کم چیزیں سکھائیے اور کتابوں کی جگہ عملی کام کی طرف زیادہ توجہ کیجیے۔ طالب علموں میں استاد اپنی مثال سے، اپنے فن سے شغف، اس کی شرافت کا احساس، محنت کی لت، کام کو ہمیشہ اپنے بس بھر اچھی سے اچھی طرح کرنے کی عادت، مریضوں سے ہمدردی کی خو پیدا کر دیں اور ان کی ذہنی تربیت کا وہ انتظام جس کا ذکر کر چکا ہوں، تو انھیں مطمئن ہونا چاہیے کہ ایک شریف فن کے اچھے اہل فن ان کی مدد سے پیدا ہوئے اور یہ اطمینان اتنا بڑا انعام ہے کہ کوئی معلم اس سے زیادہ کی آرزو نہیں کر سکتا۔

اب اس مدرسہ طبیہ کے کارکنوں سے اور خصوصاً ان طلبہ سے جو اس سال فارغ ہوئے ہیں اور آج سند لے رہے ہیں، اس گروہ کی طرف سے کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کی خدمت ان کے سپرد ہے، یعنی عام ہندستانی شہریوں کی طرف سے، اس آبادی کی طرف سے جس کا افلاس، جس کا جہل اور جس کی غلامی اسے اکثر حالتوں میں یہ جاننے بھی نہیں دیتی کہ تندرستی کسے کہتے ہیں، علاج کس کا نام ہے، دکھ درد میں کوئی مدد بھی دے سکتا ہے، اور مرنا بھی ہو تو موت کے کرب کو کوئی کم بھی کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس آبادی کی طرف سے جس کی فوجیں کی فوجیں چیچک، ہیضے، طاعون میں ہر سال ایک بے توپ، بے بندوق کی لڑائی میں کام آجاتی ہیں، جس کے لاکھوں آدمی ہر سال ملیریا میں مبتلا ہوتے اور مرتے ہیں

اور مرنے سے بچتے ہیں تو عمر بھر کو اپنی کارکردگی کھو بیٹھتے ہیں، جس نے ایک
انفلوئنزا کی وبا میں دو سال کے اندر کوئی بچاسی لاکھ آدمی ہاتھ سے کھو
دیے تھے، اس آبادی کی طرف سے جو مرض کے حملوں کے سامنے ایسی ہی
بے بس ہے جیسے شیر کے سامنے بکری، جو نہ حفظانِ صحت کے قواعد
سے واقف ہے نہ مرض کے مقابلے کی تدبیروں سے، جو سسک
سسک کر جینا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا جانتی ہے اور اپنی بے حسی
اور بے بسی کو صبر کا نام دے کر خوش ہو لیتی ہے۔ اس آبادی کو بیماریوں
سے بچانا، بیماری میں اس کا علاج کرنا آپ کے سپرد ہے۔ اس میں
گنتی کے تھوڑے سے لوگ کھاتے پیتے ہیں، باقی مفلس اور نادار۔
خوش حال بس ایسے ہیں جیسے کسی غریب کی ہانڈی میں شوربے پر
چکنائی کی چند بوندیں۔ اب آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ اپنی تمام تر
توجہ ان گنتی کے خوش حالوں پر صرف کریں گے جو بھوک سے نہیں
زیادہ کھانے سے بیمار ہوتے ہیں یا ان پر جن کے بچوں کی ہڈیاں
ٹھیک غذا نہ ملنے کی وجہ سے پوری نشوونما تک نہیں پاسکتیں اور جو
زندگی میں کبھی ایک دفعہ بھی سیر ہو کر کھانا نہیں کھاتے، اس لیے کسی
مرض کے حملے کا اچھی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آپ کا جی بھی خوش حالوں
میں شریک ہونے کو چاہتا ہو تو غالباً آپ خوش حالوں کے لیے
مقوی معجونوں اور ہاضم چورنوں کے نسخے لکھنے میں عمر گزار دیں گے۔
مگر دیس کا کام اس سے نہیں چلے گا۔ یوں تو آدمی آنکھوں پر ٹھیکریاں

رکھ دے تو کوئی اس کا کیا کر سکتا ہے۔ پر آپ کے چاروں طرف جو دُکھ اور بیماری پھیلی ہوئی ہے، افلاس اور فاقے نے عام صحت کا جو حال کر رکھا ہے، جہل نے جس طرح اس بُری حالت کو اور بدتر بنا دیا ہے اس کا احساس آپ کو ہوگا تو آپ چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔ زندگی کی بپتا، دُکھ اور بیماریاں ہم سے اتنی قریب ہیں کہ اکثر ہم ان سے غافل ہو جاتے ہیں، آہیں اتنے سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا ان سے بھر جاتی ہے اور ہم انھیں سُن نہیں سکتے اور شاید اپنی زندگی گزارنے کے لیے یہ ٹھیک ہی ہو، اس لیے کہ اگر احساس قوی ہو، ہر آہ سُنائی دے اور ہر دُکھ دکھائی دے تو ایسا ہو جائے جیسے کوئی گھاس کے اُگنے اور بڑھنے کی آہٹ سُننے لگے اور ہر جان دار کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگے اور شاید ہم اس ہیبت ناک شور کی تاب نہ لا سکیں جو بپتا کے اس سناٹے میں چھپا ہوا ہے۔ مگر یہ سُنائی دے کر چاہے ہمارے کانوں کے پردے نہ پھاڑے اور دکھائی دے کر ہماری آنکھوں کو رُلا رُلا کر بے نور نہ کرے، مگر اس کے وجود کا علم ہمیں ہے اور اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔ میری التجا آپ سے یہ ہے کہ اس دُکھ کے دور کرنے کے لیے آپ کمر باندھیں۔ ہمّت سے سب کام ہو جاتے ہیں۔ چیچک کی وبا جس سے آپ ہی کے صوبے میں ہزاروں آدمی ہر سال مرتے ہیں، یورپ میں بھی ایسی ہی عام تھی جیسی ہمارے یہاں ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ۔ وہاں تو تقریباً ہر شخص کو

یہ مرض ہوتا تھا۔ ہر بارہ آدمیوں میں سے ایک آدمی اس میں ضائع ہوتا تھا۔ جو بچ جاتے تھے ان کی بدنما آنکھیں اور چہرے عمر بھر اس مصیبت کی یاد دلاتے تھے۔ امیر غریب سب اس کے ہاتھوں تنگ تھے۔ نہ معلوم کتنے بادشاہ اس کے شکار ہوئے۔ اٹھارویں صدی میں کوئی چھ کروڑ آدمی یورپ میں اس مرض سے مرے یعنی ہر سال کوئی چھ لاکھ۔ لیکن آج یورپ اس دبا سے تقریباً پاک ہے۔

طاعون کی وبا جس میں آج بھی ہمارے ہزاروں نہیں لاکھوں ہم وطن ہر سال جان دیتے ہیں کبھی دوسرے ملکوں میں بھی عام تھا۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اگر پوچھا جائے کہ دنیا کی تاریخ میں سب سے اچھا زمانہ کون سا تھا تو میں روم کا سنہ ۹۶ اور ۱۸۰ عیسوی کے درمیان کا زمانہ بتاؤں گا"۔ گبن بڑا مؤرخ ہے اور اس کی بات کچھ وزن رکھتی ہے مگر آپ کو کچھ معلوم ہے کہ تاریخ کے اس "بہترین" زمانے میں روما میں کم سے کم تین بار طاعون کی وبا پھیلی اور سنہ ۱۶۴ء سے تو برابر سولہ سال جاری رہی۔ اِس بہترین دَور کا آغاز اسی وبا سے ہوا اور اس شدّت کی وبا سے کہ ایک ایک دن میں دس دس ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ اسی زمانے میں سارے ملک میں ملیریا پھیلا اور تین صدی تک ملک کو برباد کرتا رہا، تاآنکہ جرمن جنگلوں کے غیر متمدّن قبیلوں نے اسے تاخت و تاراج کیا۔ لیکن باوجود اس کے گبن نے اسے سب سے اچھا زمانہ اس لیے کہا کہ

گبن کے زمانے تک اِس وبا کے جو حملے یورپ میں ہوتے رہے وہ ان سے بھی زیادہ ہولناک تھے۔ گبن کے لکھنے کے وقت یورپ پر طاعون کی چار صدیاں گزر چکی تھیں۔ ان مغربی شہروں میں بھی یہاں کی طرح روزانہ ہزاروں موتیں ہوتی تھیں مگر آج اس مرض کے اسباب معلوم ہو جانے سے اور انھیں قابو میں لانے کی کوشش سے یورپ اس مرض سے آزاد ہو گیا۔ ابھی ۱۷۹۳ء میں فلے ڈلفیا کی آبادی میں ہر سو میں دس آدمی پیلے بخار کا شکار ہو گئے تھے۔ مگر امریکن ڈاکٹروں کے علم اور محنت نے اپنے ملک کو اس عذاب سے بچا لیا۔ اور مثالیں دینے سے کیا فائدہ، آپ کے سامنے ایک مہتم بالشان کام ہے، مضبوط دل اور بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام ہے، خود غرضوں کے لیے پیسے کمانے کا موقع ہے مگر اُن کے سینے پر ہمیشہ یہ بوجھ رہے گا کہ انھوں نے اپنے بنی نوع، اپنے ہم قوموں کے افلاس، جہل، غلامی، بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ دھات کے ٹکڑے جمع کر لیے اور مرض اور بیماری کے خلاف جہاد کرنے اور اپنی قوم کو اس سے نجات دلانے کے مبارک کام میں ہاتھ نہ بٹایا۔ بے شک اپنی گزر اوقات کے لیے بھی ہر آدمی کو کچھ درکار ہوتا ہے۔ آپ کی گزر اوقات کا انتظام حکومت کو کرنا چاہیے۔ آپ کے پیشے کے لوگوں کے لیے پرانے زمانے میں یہی دستور تھا۔ حکومت ان کی سب ضرورتیں پوری کرنے کا انتظام کر دیتی تھی اور یہ یکسوئی سے امیر و غریب کی خدمت بلا امتیاز کیا کرتے

تھے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں جب کہ حکومت کا سہارا اُٹھ گیا تھا
جس طرح طبیبوں کے بہت سے مشہور خاندانوں نے سارے ملک میں
غریبوں کی خدمت کی ہے وہ ہماری قومی زندگی کا سرمایۂ فخر ہے۔
دولت کے زنگ سے قومی زندگی کے جوہر کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی
چیز اتنی مؤثر نہیں ہوتی جتنا کہ بے غرض کام کرنے والوں کا ایسا گروہ
جو اس کے طوق زریں کا آرزومند نہ ہو بلکہ جس کی ساری توجّہ حق کی تلاش
سچ کے پرچار اور انسانوں کی خدمت کے لیے وقف ہو۔ میری دُعا
ہے کہ آپ کے مدرسے سے سند لینے والے اس گروہ میں شامل ہوں
اور سچے سپاہیوں کی طرح دیس کو جہالت اور بیماری کے دشمنوں سے
نجات دلائیں۔

بُنیادی تعلیم

(یہ وہ خطبہ ہے جو بُنیادی تعلیمی کانفرس،
جامعہ نگر، میں ۱۱ اپریل ۱۹۴۱ء کو پڑھا گیا)

راجن بابو، بھائیو اور بہنو!

آج بُنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس شروع ہو رہی ہے۔ ہمارے بُلاوے پر آپ سب لوگ دور اور نزدیک سے سفر کی تکلیفیں اُٹھا کر، کاموں کا ہرج کر کے اس میں شریک ہونے آئے ہیں۔ ہم آسانی سے آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ مگر یقین جانیے کہ ہم دل سے آپ کے شکرگزار ہیں۔ ہمیں بڑی امید ہے کہ اپنی بات سُنا کر اور دوسروں کی سُن کر، اپنی کامیابیوں سے اوروں کی ہمّت بڑھا کر اور اپنی ناکامیوں سے دوسروں کو ہوشیار کر کے، آپ کے یہاں ملنے سے ملک صحیح بنیادی تعلیم کی راہ پر ایک قدم اور آگے بڑھ سکے گا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پہلی بنیادی کانفرنس کو ایک مال دار صوبے کی حکومت نے بلایا تھا۔ آج آپ ایک غریب قومی ادارے کے بُلاوے پر

یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آپ کو اگر رہنے سہنے اور کھانے پینے کا ویسا آرام نہ ہو تو ہمیں معاف کر دیجیے اور یقین جانیے کہ آپ کے آرام میں اگر کوئی کمی ہے تو اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم آرام دینا نہیں چاہتے بلکہ شاید اس وجہ سے ہو کہ ہمارے پاس اس کا پورا سامان نہیں ہے اور مجھے تو یقین ہے کہ آپ شاید ان چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو دھیان میں بھی نہ لائیں گے۔ لیکن پہلی اور دوسری کانفرنس کے اس فرق سے دھیان اس طرف ضرور جاتا ہے کہ یہ بنیادی تعلیم کا کام ہے کس کا، حکومت کا یا نجی آدمیوں اور اداروں کا؟ میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اس بات کو اچھی طرح سوچیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے بنیادی تعلیم کی تجویز نجی آدمیوں نے بنائی تھی۔ اگر کوئی حکومت ان کی تجویز کو نہ اپناتی تب بھی شاید لوگ تعلیم کے جس انداز کو ٹھیک سمجھتے تھے اس کو کہیں نہ کہیں موقع پا کر چلاتے اور اپنے تجربے سے اداروں کو شاید کوئی نئی راہ دکھا سکتے یا جیسے بہت سی خیالی تجویزیں بنائی جاتی ہیں، یہ تجویز بھی بنائی جاتی اور ایک چھوٹی کتاب کی شکل میں کہیں نہ کہیں کسی کتب خانے میں ملا کرتی۔ لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کے خیال میں یہ پہلی اور دوسری صورت برابر ممکن تھی؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ تجویز بنی ہی اس لیے تھی کہ بنانے والوں کے نزدیک ہمارے ملک میں ایک اچھی ریاست کے بننے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ اگر وہ ریاست بن جائے تو وہ اس کام کو سنبھالے وہ نہ بنے تو تعلیمی کام

کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اسے چلائیں اور اس کو چلا کر سچی اور اچھی ریاست کے آنے کا وقت نزدیک لے آئیں۔ اس تجویز کے بنانے والوں کو ضرور معلوم ہوگا کہ اچھی ریاست کا بننا کھیل نہیں، بنتے بنتے بنتی ہے۔ اس لیے شاید وہ پہلے ہی دن سے ریاست کی مدد کے بغیر چلانے کے لیے کمر کسے چکے ہوں گے۔ یہ تو بس اتفاق کی بات تھی کہ اس تعلیمی تجویز کو کئی صوبوں کی حکومتوں نے تھوڑی بہت کتر بیونت کے بعد ایک ہی وقت میں مان لیا اور بغیر بہت تیاری کے اور کہیں کہیں تو ایسے لوگوں کے ہاتھوں جنھیں اس پر پورا بھروسا نہ تھا اسے چلا بھی دیا، کہیں چھوٹے پیمانے پر کہیں بڑے پیمانے پر، اور آج بھی ان میں سے کئی جگہ تو یہ تجربہ بڑی محنت سے چلایا جا رہا ہے، کہیں کہیں ذرا بے دلی سے ایسے گھسیٹ رہے ہیں جیسے بس کیے کی لاج ہو اور ایک آدھ جگہ تو آٹھ دس مہینے کے "لمبے" تجربے کے بعد جیسے تھک کر یا پشیمان ہو کر اس سے توبہ بھی کر لی گئی ہے! اس میں تو شک نہیں کہ یہ حکومتیں اس تجویز کو مان نہ لیتیں تو اس پر جتنا تجربہ ہوا ہے وہ نہ ہو پاتا۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ حکومت کے باہر بھی لوگوں میں شاید اس سے اتنی خواہ مخواہ کی بے زاری بھی نہ ہوتی۔ صرف اس وجہ سے کہ بعض ایسی حکومتوں نے اسے چلایا جن سے یہ لوگ راضی نہ تھے وہ اس تجویز کو جانچنا اور ماننا تو کیا ایک نظر دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ یہ بھی ہوا کہ حکومت نے اسے حکم سے چلوایا اور

کام کہیں کہیں تو ضرور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آیا جو خود یا تو اس تجویز کو سمجھے نہیں تھے یا کسی ایسی وجہ سے جس کا تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں اسے پسند نہ کرتے تھے، گویا حکومت کے ہاتھ میں اس تجویز کے آنے سے اگر فائدہ ہوا تو نقصان بھی ضرور ہوا۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس کام کو حکومتوں ہی کے ہاتھ میں دیں یا یہ کہ غیر سرکاری قوتوں کو اس کی خدمت میں لگائیں۔ میں اپنی رائے آپ کو بتا دوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے۔ یہ اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا کام ہے کہ نجی کوششیں اسے سمیٹ نہیں سکتیں۔ لیکن اگر ریاست کسی ایک فرقے یا ایک گروہ کی حکومت کا نام ہے تو یہ ایسی چلتی پھرتی چھاؤں ہے کہ تعلیم اس کے ہاتھ میں کبھی زیادہ دیر تک سیدھے راستے پر نہیں چل سکے گی۔ ہاں ریاست اگر سماجی زندگی کی اس تنظیم کو کہتے ہیں جس کی بنا عدل پر ہو، جو خود روز بروز اپنی اس بنیاد کو مضبوط کر کے اخلاقی ترقی کرتی جاتی ہو اور دن پر دن اپنے شہریوں کی کوشش سے ہر گروہ اور ہر طبقہ کیا ہر آدمی کی اخلاقی شخصیت کی پوری ترقی کا راستہ اس میں سہل سے اور سہل ہوتا جاتا ہو، تو پھر تعلیم ایسی ریاست کا سب سے ضروری کام ہے، اس لیے کہ خود اس کی اخلاقی ترقی اس کام سے ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی ریاست کامل بے عیب ریاست نہیں ہو سکتی، مگر بعض ریاستوں کی نیو اخلاق اور نیکی پر ہوتی ہے بعض کی نہیں ہوتی، بعض

اخلاقی بہتری کی طرف چلتی ہیں بعض نہیں چلتیں، بعض عدل کے قریب ہونا چاہتی ہیں بعض نہیں چاہتیں، بعض میں سب کے لیے ترقی کی راہیں کھلی ہوتی ہیں بعض میں کچھ کے لیے کھلتی ہیں اور کچھ کے لیے اور بند ہو جاتی ہیں۔ بنیادی تعلیم کا کام پہلی قسم کی ریاست کا کام ہے۔ دوسری قسم کی ریاست کے ہاتھ میں یہ نہ پہنچے تو اچھا ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی اس اخلاقی ریاست کا بننا باقی ہے۔ پھر جب تک وہ نہیں بنتی کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ نہیں۔ جس طرح آزاد اور اچھے آدمیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنی سماجی زندگی کی بنیاد ایسی اخلاقی ریاست پر رکھیں جیسی کہ میں نے ابھی بیان کی ویسے ہی ہر سچے تعلیمی کام کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ ایسی ریاست کے بننے میں اپنے کام سے مدد دے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا کام اس ریاست میں بہت کٹھن ہوگا لیکن اس وجہ سے اسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا۔ ہاں، یہ ضرور جاننا چاہیے کہ کھودنا بہت ہوگا اور پانی بہت کم نکلے گا۔ مگر کیا عجب ہے کہ اس محنت ہی سے لوگوں کا دھیان کچھ پلٹے اور ہمارے ملک میں وہ ریاست وجود میں آجائے جو ہمارے دھیمے کام کو ایک ہی ہلے میں کہیں سے کہیں پہنچا دے۔

اس وقت ہماری خوش قسمتی سے بابو راجندر پرشاد جی یہاں موجود ہیں اور ہماری کانفرنس کا ابھی چند منٹ میں افتتاح فرمائیں گے۔ میں ان کی معرفت تعلیمی کام کرنے والوں کی یہ التجا اپنے ملک کے

سب سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم، قوم پر بھروسا کر سکے، کم زوروں کو زورآور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن، تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں، جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر، کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر، کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں، کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں، کب تک ہم اس ڈر سے تھرتھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں، اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی ایک دل نظر نہیں آتے،

کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی، جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں، کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجیے اور جلد کیجیے۔ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

بھائیو اور بہنو! میں نے راجن بابو کے یہاں ہونے سے فائدہ اُٹھا کر یہ جو باتیں کہیں وہ میں جانتا ہوں کہ آپ سب کے دل کی گونج ہیں۔ لیکن اگر راجن بابو کچھ نہ کریں یعنی سیاسی رہنما کچھ نہ کریں یا نہ کر سکیں تو کیا ہمیں تھک کر بیٹھ جانا چاہیے؟ ہو سکتا ہے کہ تھکاوٹ ہم میں اتنا دم نہ چھوڑے کہ ہم کچھ کر سکیں، مگر جب تک ایسا نہیں ہے اس بات کا خیال بھی اچھا نہیں لگتا۔ اگر ہم کو بھروسا ہے کہ بنیادی تعلیم کا کام ہماری قوم کے لیے ایک ضروری کام ہے تو ہمیں بیٹھے بیٹھے سیاست کا مُنہ تکنا نہ چاہیے کہ جب وہ درست ہو جائے اور جب ایسی ریاست بن جائے جو اپنے کندھوں پر سب شہریوں کی تعلیم کا بوجھ اٹھا سکے تو اُس وقت ہم بھی اس کی مدد کریں گے۔ نہیں، اگر ہم آج ہی سے اس اچھے کام میں لگے نہ رہیں گے تو شاید اس وقت بھی اپنی بے سمجھی اور ناتجربے کاری سے کام کو بگاڑیں گے۔ اچھی سے اچھی ریاست بھی تو اپنے ایک اشارے سے وہ چشمے نہیں بہا سکتی جن کے سوت پہلے سے رستے نہ ہوں۔ اس لیے اس کام کو تو چلانا ہی ہے اور

اس طرح چلانا ہے کہ جب کوئی حکومت بنیادی تعلیم کے کام کو ہاتھ میں لینا چاہے تو وہ یہ نہ کہہ سکے کہ ہم جانتے نہیں کہ یہ کام کیسے ہوگا اور ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ اور یہی نہیں، جب حکومتیں اس کام کو سنبھال لیں اور اسے ہماری منشا کے موافق ہی چلائیں، تو کیا اس وقت ہمارا کام ختم ہو جائے گا؟ میں سمجھتا ہوں کہ نہیں۔ کوئی ریاست ایسی نہیں ہوتی کہ اس میں ترقی کی ضرورت نہ ہو۔ ہر اچھی ریاست، اگر سچائی اور نیکی پر اس کی بنا ہے، اچھی سے اور اچھی ہوتی جاتی ہے۔ آدمی کے سب اداروں کا یہی حال ہے، آگے بڑھتے ہیں، نہیں تو پیچھے ہٹنا ہوتا ہے۔ اچھی ریاست ہوتی ہی وہ ہے جس کے شہری اپنی زندگیوں سے اسے برابر بہتر بناتے جائیں۔ اس لیے اگر ریاست نے بنیادی تعلیم کے کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تب بھی اچھے سمجھ دار اور تعلیم کے کام سے لگاؤ رکھنے والوں کی ایک فوج کی فوج اس تعلیم کو بہتر بنانے میں حکومت کے مدرسوں کے باہر بھی لگی ہوگی۔ وہ ایسے تجربے کر سکیں گے جو حکومت شاید اپنے کام کے پھیلاؤ کی وجہ سے نہ کر سکے اور وہ اپنے تجربوں سے، ان کی کامیابیوں سے اور ان کی ناکامیوں سے، حکومت کے پھیلے ہوئے تعلیمی کام کو نئی راہیں دکھا سکیں گے۔ مختصر یہ کہ غیر سرکاری لوگوں پر کام کا بوجھ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ سیاسی ادل بدل ہوتے رہیں گے، مگر بنیادی تعلیم کا کام چلے گا، کبھی حکومت کے ہاتھوں کبھی حکومت کی مدد کے بغیر۔ بنیادی تعلیم کی

تجویزیں جو چیزیں بنیادی ہیں انھیں اب ہماری قوم، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ہاتھ سے نہیں دے گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب کبھی ہمارے ملک میں ایسی حکومت ہوگی جو سب کی بھلائی یکساں چاہے گی، جو امیر غریب، ہندو مسلمان، ہندوستانی غیر ہندوستانی میں فرق نہ کرے گی اور جو سب کی رضامندی سے اور سب کی بھلائی کے لیے ہوگی تو وہ اپنے سب لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے کم سے کم سات سال کی مفت تعلیم کا انتظام کرے گی اور اسے لازمی بنائے گی۔ میں نے سات سال کم سے کم کہا۔ اس ریاست کے وسائل بڑھیں گے تو شاید وہ اس مدّت کو بڑھائے گی۔ لیکن اب کسی ذمّے دار حکومت میں "اپر پرائمری" اور "لور پرائمری" اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے ناموں کے چکّر میں آکر قوم کبھی سات سال سے کم مدّت کی مفت اور لازمی تعلیم پر راضی نہ ہوگی۔ دوسری بات جو اس طرح آخری طور پر طے سمجھنی چاہیے یہ ہے کہ یہ سات سال کی تعلیم مادری زبان میں ہوگی۔ تیسری بات جو میری رائے میں انھیں دو کی طرح کبھی ہاتھ سے نہ دی جائے گی وہ یہ ہے کہ تعلیم کے ان سات سال میں کام کو بیچ کی جگہ دی جائے گی اور جہاں تک ہو سکے گا اس کے ذریعے دوسری سکھانے اور بتانے کی چیزیں سکھائی اور بتائی جائیں گی۔ اس تیسری بنیادی بات کا بھی میرے علم میں تو کوئی دل سے مخالف ہے نہیں، مگر یہ ذرا نئی سی بات ہے اس لیے اس کے سمجھنے میں خود

بنیادی تعلیم کا کام کرنے والوں کو بھی دقت ہوتی ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں اس وقت تھوڑے سے لفظوں میں اپنا خیال بتاؤں کہ تعلیمی کام کے معنی کیا ہیں اور ہم جو کتابوں کے مدرسوں کو کام کے مدرسوں میں بدلنا چاہتے ہیں تو کام سے کیا مطلب لیتے ہیں، یا کیا مطلب لینا چاہیے۔

کام کو تعلیم میں داخل کرنے کا چرچا آج سے نہیں بہت دنوں سے ہے۔ مگر جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا ہے کام کو اصول کے طور پر مانو، اسے مضمون نہ بناؤ۔ کوئی کہتا ہے اسے ایک مضمون بنا دو، اسے ایک گھنٹا دے دو مگر اور سب کام جوں کا توں رہنے دو۔ کوئی کہتا ہے کام ایسا ہو کہ کچھ دام بھی ہاتھ آئیں۔ کوئی کہتا ہے حرکت میں برکت ہے بچوں کو زرا ہاتھ پیر چلانے کا موقع دو چاہے کچھ بنے یا نہ بنے، یہ کوئی مزدوروں کا کام تھوڑے ہی ہے یہ تو "تخلیقی" کام ہے۔ میں ان لوگوں میں سے کسی سے جھگڑا مول نہیں لیتا، صرف اپنا خیال ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب ہم تعلیم کے سلسلے میں کام کا ذکر کریں تو ہمیں وہی کام دھیان میں رکھنا چاہیے جس سے تعلیم ہو، ذہن کی تربیت ہو، آدمی اچھا آدمی بنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کا ذہن اپنے کیے کو پرکھ کر اس کے اچھے برے پر نظر کر کے، ترقی کرتا ہے اور آدمی جب کچھ بناتا ہے یا کوئی کام کرتا ہے، چاہے یہ کام ہاتھ کا ہو چاہے دماغ کا، تو اس کام سے اسے ذہنی تعلیمی فائدہ

اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ اس کام کا پورا پورا حق ادا کرے، اس کام کے لیے اپنے کو زرا تجے، اپنے اوپر زرا قابو پائے۔ کام سے تعلیمی فائدہ وہی اُٹھاتا ہے جو اس کام کا حق ادا کرنے میں اس کام کے ڈسپلن کو اپنے اوپر اوڑھ لے۔ اس لیے ہر کام تعلیمی کام نہیں ہوتا۔ کام تعلیمی جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو دخل نہ ہو وہ کام مُردہ مشین بھی کر سکتی ہے اور اس سے ذہن کی تعلیم یا تربیت نہیں ہوتی۔ کام سے پہلے کام کا نقشہ، کام کا خاکہ ذہن میں بنانا ضروری ہے۔ پھر دوسرا قدم بھی ذہنی ہوتا ہے، یعنی اس نقشے کو پورا کرنے کے ذریعے سوچنا، ان میں سے کسی کو لینا کسی کو چھوڑ دینا۔ تیسرا قدم ہوتا ہے کام کو ان چنے ہوئے ذریعوں سے کر ڈالنا۔ اور چوتھا قدم ہے کیے ہوئے کو پرکھنا کہ جو نقشہ بنایا تھا، جو کرنا چاہا تھا وہی کیا اور جس طرح کرنے کا ارادہ کیا تھا اسی طرح کیا یا نہیں اور نتیجہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اسے کیا جاتا۔ یہ چار منزلیں نہ ہوں تو تعلیم کا کام ہو ہی نہ سکے گا۔ لیکن اگر یہ چاروں ہوں تب بھی ہر کام تعلیمی نہیں ہو جاتا۔ ہر ایسے کام سے کچھ ہنر مندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ چاہے ہاتھوں کی ہنر مندی ہو، چاہے ذہن کی، چاہے زبان کی۔ لیکن ہنر مندی تعلیم نہیں ہے۔ تعلیم پائے ہوئے آدمی کی جو تصویر ہم سب کے سامنے آتی ہے اس میں خالی ہنر مندی کا رنگ نہیں ہوتا۔ ہنر مند چور بھی ہوتے ہیں، ہنر مند

دھوکے بھی دیتے ہیں، ہنرمند سچ کو جھوٹ بھی کر دکھاتے ہیں۔ ایسی ہنرمندی تو تعلیم کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ تعلیمی کام وہی کام ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت کرے جو ہماری خودغرضی سے پرے ہو اور جسے ہم مانتے ہوں۔ جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند ضرور ہو جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے، اپنا مزہ نہیں ڈھونڈتا۔ اس سے وہ آدمی بنتا ہے، اپنا اخلاق سنوارتا ہے اس لیے کہ اخلاق اور ہے کیا اس کے سوا کہ جو قدریں ماننے کی ہیں ان کی سیوا میں آدمی اپنی خواہشوں اور لالچوں اور مزوں کو دبائے اور اس قدر کی پوری پوری سیوا کرے اور اس سیوا کا جو حق ہے وہ پورا پورا ادا کرے۔ کام کی یہ صفت ہاتھ کے کام میں بھی ہو سکتی ہے اور ہاتھ کا کام بھی اس سے خالی ہو سکتا ہے اور دماغ کا بھی۔ سچے کام کا مدرسہ وہی ہے جو بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالے تاکہ کام سے اس بات کی عادت سی ہو جائے کہ جب کبھی کوئی کام کریں، ہاتھ کا یا دماغ کا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا، کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا۔ کام سب کچھ کرکے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے، با مقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح آپ اپنا

محاسبہ کرتا ہے، پھر اس میں پورا اُترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی، کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔

لیکن ریاضت اور عبادت میں بھی تو لوگ خودغرض ہو جاتے ہیں، اپنی جنت پکی کر لی دوسرے سے کیا مطلب۔ کام کا سچا مدرسہ اگر صحیح تعلیم کی جگہ ہے تو کام کو کبھی اکیلے کی خودغرضی نہیں بننے دیتا بلکہ سارا مدرسے کا مدرسہ ایک کام میں لگی ہوئی جماعت بن جاتا ہے جس میں سب مل کر کام کرتے ہیں اور سب کے کام ہی سے سب کام پورا ہوتا ہے، سب سے سب کا کام نکلتا ہے اور سب کے کیے بغیر کام بگڑتا ہے۔ کسی ایک کی غلطی سے سب کے کام کا ہرج ہوتا ہے، کم زور کو پیچھے چھوڑ کر آگے چل دینا مشکل ہوتا ہے۔ یوں مل جل کر کام کرنے میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے تو وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جس کی ہمارے ملک میں بڑی کمی ہے یعنی آدمی کا آدمی سے نباہ کر سکنا اور ذمے داری کا وہ احساس جس سے سماج کا ہر کام ہر ایک کا کام بن جاتا ہے۔

اور پھر کام کا اچھا مدرسہ اس پر بھی راضی نہیں ہو جاتا کہ اس کے بچوں نے کام سے اپنی تربیت کر لی۔ کام سے اس کے بچے ایک سماج سے بن گئے، اور اس کے فرض اور ذمے داریاں جاننے اور سمجھنے ہی نہیں بلکہ برتنے اور اٹھانے بھی لگے۔ بلکہ کام کا اچھا مدرسہ اس ملے سے کے سماج کو بھی کسی اونچے مقصد کا سیوک بناتا ہے تاکہ کہیں یہ نہ ہو کہ بچے اکیلوں کی خودغرضی سے تو بچ جائیں مگر اس سے بچ کر سماجی خودغرضی

کی دلدل میں پھنس جائیں۔ غرض کام کا مدرسہ اگر بن جائے تو وہ اپنے بچوں کو اس طرح کام کرنا سکھا دیتا ہے جیسا کہ کام کا حق ہے۔ ان کو مل جل کر کام کرنے کا موقع دیتا ہے اور ان میں یہ یقین پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا کام سماج کی خدمت ہے اور پھر اس سماج میں بھی اس بات کی لگن پیدا کر دیتا ہے کہ آدمی کے خیال میں اچھی سے اچھی سماج کا جو نقشہ آسکتا ہے اس سے اس کی سماج روز نزدیک ہوتی جائے۔ وہ اس بات کی بنیاد ڈالتا ہے کہ سماج میں ہر آدمی کوئی کام کا کام کرے اس کام کو اپنا سماجی منصب اور اخلاقی فرض جانے اور اپنے کاموں سے اور اپنی زندگی سے اپنی سماج کو اچھی سماج بنانے میں مدد دے۔

اگر کبھی ہماری سماج اچھی سماج بن گئی تو وہ ایسے مدرسوں بغیر ایک دم بھی کیسے چین لے گی، لیکن جب تک پہلے ایسے مدرسے نہ ہوں گے وہ سماج آسانی سے بن کیسے جائے گی؟ اس لیے جس سے بن پڑے ایسے مدرسے بنائے۔ میری درخواست صرف آپ سے نہیں جو بنیادی تعلیم کے ساتھی ہیں ان سے بھی ہے اور دل سے ہے جنھوں نے بنیادی تعلیم کی تجویز کو برا جانا ہے۔ میں ان سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بنیادی تعلیم اگر وہی چیز ہے جو میں نے ابھی بیان کی تو آپ اس کے مخالف کیسے ہو سکتے ہیں؟ ضرور ہے کہ کسی اور چیز نے آپ کو اس کا مخالف بنایا ہو۔ شاید آپ کو بنیادی تعلیم کے اس نصاب میں جو ایک نجی کمیٹی نے بنایا تھا کچھ باتیں نہ بھاتی ہوں گی، کچھ باتیں آپ کے نزدیک اس میں کم ہوں گی،

کچھ ایسی ہوں گی جنھیں آپ ناپسند کرتے ہوں گے۔ مگر نصاب بنیادی تعلیم کی اسکیم نہیں ہے، نصاب اصول نہیں ہے، نصاب ایسا نہیں کہ بدلا نہ جا سکے۔ نصاب پیش کرتے وقت بھی ان نصاب بنانے والوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ امتحانی اور آزمایشی چیز ہے، اس پر آج تک کوئی آدھی درجن کمیٹیوں نے غور اور بحث کر کرکے کچھ کچھ گھٹایا بڑھایا ہے اور بہت کچھ مان لیا ہے۔ لیکن یہ ماننا بھی کوئی آخری بات نہیں۔ ابھی دو دن بعد اسی کانفرنس میں اس نصاب پر بحث ہوگی اور نہ جانے اس کے کتنے عیب سامنے آئیں گے لیکن ان عیبوں کی وجہ سے تجویز کے بنیادی اصولوں کو جو کہ میری رائے میں صحیح اور درست ہیں چھوڑ نہ دینا چاہیے۔ اس میں چھوڑنے والے ہی کا نقصان ہے۔ ان اصولوں کو سامنے رکھ کر دوسرا نصاب بنایئے، اسے کچھ مدرسوں میں آزمایئے اور خود اپنے نتیجے کو پرکھیے۔ اچھا ہوگا تو دوسرے بھی اس سے فائدہ اُٹھائیں گے اور اگر آپ غلطی پر ہوں گے تو غلطی سمجھ میں آجائے گی۔ شاید آپ اس تجویز کو اس وجہ سے ناپسند کرتے ہوں کہ جنھوں نے اسے بنایا ہے آپ کو وہ لوگ پسند نہیں۔ لیکن اچھی اور ٹھیک بات تو اچھوں کا کھویا ہوا مال ہے جہاں بھی ہو وہ اسے اٹھا لیتے ہیں۔ اس بات سے آپ کیوں اپنے فیصلے پر اثر ڈالتے ہیں کہ پہلے یہ تجویز کس نے بنائی اور کہاں بنائی اور کن لوگوں نے پہلے اس کو مانا۔ ناموں کی نہ پرستش ہی کرنی چاہیے، نہ ناموں سے یوں بھڑکنا چاہیے۔

مجھے معاف کیجیے میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا۔ میں دل سے آپ سب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ کے سامنے تین دن خاصا محنت کا کام ہے، پھر ان تین دن کے بعد اور بھی محنت آپ کے لیے ہے یعنی یہاں جو کچھ سوچا جائے گا اُسے کرنا ہے۔ اگلے سال پھر اپنے کام کے نتیجوں کو پرکھنا ہوگا اور جس طرح ہم اپنے کام کے مدرسوں میں بچوں کو کام سے تعلیم دینا چاہتے ہیں اسی طرح خود اپنے کام سے اپنی تعلیم کا کام لینا ہوگا۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے کو اپنے کام سے اس کا اچھا چاکر بنا سکیں۔ اس سے دعا ہے کہ ہمیں سیدھی راہ دکھائے، ان لوگوں کی راہ جن پر اس نے انعام کیا اور ان کی راہ سے بچائے جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے اور جن سے وہ ناخوش ہوا۔

بچّوں کی تربیت

(۱)

(یہ وہ تقریر ہے، جو ۱۰ مارچ ۱۹۳۶ء کو

آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے نشر کی گئی)

ہماری رنگا رنگ دُنیا میں ایسی چیزوں کی کیا کمی ہے، جنھیں دیکھ کر آدمی اچنبھے سے اُنگلی دانتوں میں دبالے، مگر آدمی کے بچّے سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی شاید اور کوئی چیز نہیں۔ کسی اور جان دار کا بچّہ شاید اتنا بے بس نہیں ہوتا، نہ اتنے عرصے تک اپنے ماں باپ اور بڑوں کا منہ تکتا ہے۔ کوئی اور بچّہ اپنی ساری قوتوں کو پوری ترقی دینے میں اتنی دیر نہیں لگاتا۔ پہلے تو اس کی بے بسی اور سُست رفتاری پر ہنسی آتی ہے! پر ذرا سوچیے تو خیال ہوتا ہے کہ یہ دُنیا کے حاکم اور بادشاہ، انسان کا بچہ ہے، شاید قدرت چاہتی ہے کہ بڑا ہوتے ہوتے اس بادشاہت کے کام کے لائق ہو جائے، اسی لیے اس کا نصابِ تعلیم اتنا لمبا رکھا گیا ہے۔ اس کے جسم کی ترقی تک میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے خاص اہتمام کیا ہے کہ کام خوب پکّا ہو، کہیں جلد بازی

میں خراب نہ ہو جائے، کچھ بڑھتی ہے، پھر رُکتی ہے۔ گویا قدم قدم پر پختگی کا پورا پورا انتظام کرتی چلتی ہے۔ پہلے سال بچّہ بڑی تیزی سے بڑھتا ہے مگر دو سال سے پانچ سال کی عمر تک قدرت رفتار کو سست کر دیتی ہے۔ پہلے سال کے کھینچاؤ کے بعد یہ بھراؤ کا زمانہ ہوتا ہے۔ پانچ سے سات سال تک بچّہ پھر تیزی سے بڑھتا ہے۔ یہ کھینچاؤ کا دوسرا زمانہ ہے، جس کے بعد سات سے گیارہ برس تک پھر بھراؤ کے لیے رکھے ہیں۔ اس کے بعد ایک بار پھر کھینچاؤ ہوتا ہے اور اسی سے متصل ایک بھراؤ کا دَور اور آتا ہے، جو اسے ترشا ترشایا ولولہ اور اُمنگ والا نوجوان بنا دیتا ہے۔ غرض قدرت اپنا کام خوب ٹھوک بجا کر کرتی ہے، اس لیے کہ یہی تو اس کے خزانوں کا مالک ہے اور یہی اس کی دُنیا کا سردار۔

ہاں، غریب قدرت بہت کچھ کر دیتی ہے مگر سب کچھ تو نہیں کر سکتی۔ اس ننھی سی جان کو دُنیا میں، خدا کے خلیفہ کے رُتبے تک پہنچانے میں، اس کے ماں باپ، رشتے دار اور ساری اردگرد کی انسانی دُنیا کو بھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے اور اکثر اسی حصّے میں کسر ہو جاتی ہے اور آدمی کے سپرد اپنے بچّوں کی تربیت اور دیکھ بھال کا جو کام ہے اس میں وہ ایسی ایسی حماقتیں کر گزرتا ہے کہ اکثر قدرت کا منشا پورا نہیں ہو پاتا، اور منشا پورا ہونا تو رہا دور، ہمارے دیس میں تو لاکھوں بچّوں کو پیدایش کے سال بھر کے اندر اندر ہی اس دُنیا ہی سے رخصت کر دیا جاتا

بچے اور لاکھوں کو پانچ سال تک پہنچنے سے پہلے پہلے ۔ جو بچ رہتے ہیں، وہ ابا جان کی نادانی، نانی اماں کے لاڈ پیار کا تختۂ مشق بنتے ہیں۔ ذہن میں طرح طرح کی گتھیاں ڈال دی جاتی ہیں جو عمر بھر سلجھائے نہیں سلجھتیں۔ ان سے بھی کوئی بچ نکلے تو مدرسوں میں ایک سے ایک بقراط اُستاد پڑا ہوا ہے، وہ انھیں آدمی بنانے کی کوشش میں، جانوروں سے بدتر درجے پر پہنچا دیتا ہے اور جب یہ دُنیا میں، خدا کی خلافت کا کاروبار سنبھالنے نکلتے ہیں تو نہ تن درست ہوتا ہے نہ من، نہ ولولہ نہ اُمنگ، نہ ہمت نہ یقین، ڈرے ڈرے سہمے سہمے، ہر چیز سے خوف، ہر چیز پر شبہہ، نہ کسی سے لگاؤ نہ کسی پر بھروسا، نہ کام کا شوق نہ تفریح کا سلیقہ، کچھ کرتے بھی ہیں تو غلاموں کی طرح، سزا کے ڈر سے یا انعام کے لالچ سے، نہ اپنے اردگرد کی حقیقتوں سے آشنا، نہ ان سے دوچار ہونے کی قابلیت، خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور ہوائی منصوبے گانٹھتے ہیں، جنھیں قدم قدم پر زندگی کی سخت حقیقت پاش پاش کر دیتی ہے، یہ زندگی کو بیکار جاننے لگتے ہیں اور زندگی ان سے بیزار رہتی ہے، دُنیا ان کے لیے قید خانہ اور یہ دُنیا کے لیے عذاب۔

اس بدحالی کو اور بڑوں کی مداخلت سے چھوٹوں کی زندگیاں تلخ اور بے اثر ہوتے دیکھ کر، بعض نیک دل لوگ تو یہ تک کہنے لگے ہیں کہ بچوں کی تربیت کے لیے کچھ کرنا ہی نہ چاہیے، انھیں اپنے حال پر چھوڑ دو، تو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہیں گے۔ اس خیال میں کچھ تو ماں باپ

اور استادوں کی غفلتوں اور غلطیوں پر بجا غصّے کی آمیزش ہے مگر ساتھ ہی آزادی کے فلسفے کی نظروں کو چکا چوند کرنے والی چمک کا بھی تھوڑا بہت میل ہے، جس کی تیز روشنی کبھی کبھی غریب تاریکی میں رہنے والوں کی رہی سہی نظر کو بھی ختم کر ڈالتی ہے اور یہ بے چارے بے سمجھے الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر نہ اِدھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے۔
بچوں پر طرح طرح کی پابندیوں کے بُرے نتائج دیکھ کر بہت سے اچھے سمجھ دار لوگوں نے ان پابندیوں کو کم کرنے کی طرف توجّہ دلائی ہے جو اپنی جگہ پر ٹھیک بات ہے، مگر اس سے ہمارے یہاں کے خیالوں کے اُچکّے نہ جانے کیا سمجھ لیتے ہیں اور لگتے ہیں تلقین کرنے کہ بس بچّوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ سو گزارش یہ ہے کہ ہاں چھوڑ سکیے تو ضرور چھوڑ دیجیے۔ مگر آپ کا ننّھا ایک تن درست بچّے کی ساری قوتیں لے کر دُنیا میں آیا ہو تو یہی کوئی بیس بائیس ہزار سال کی عمر پاتے پاتے تہذیب و شائستگی کے اس مرتبے پر پہنچ جائے گا جس پر خیر سے آپ ہیں، کہ اپنی موجودہ حالت پر پہنچنے کے لیے کہتے ہیں کہ، انسانیت کو کم بڑھ اتنا ہی زمانہ لگا ہے!
اس مدّت پر مجھے ایک قصّہ یاد آیا۔ کہیے تو سُنا دوں۔ مگر ہاں! آپ اس وقت تو مجھ سے کچھ فرما نہیں سکتے، صرف سُن سکتے ہیں، خیر بے کہے ہی سُنیے! آپ جانتے ہیں کہ امریکا کے لوگ دُنیا کے سارے نو دولتوں کی طرح ہر چیز کی قیمت بہت پوچھا کرتے ہیں۔ ایک امریکن

کروڑپتی ایک مرتبہ اکسفورڈ پہنچے۔ کہتے ہیں کہ اکسفورڈ کے ہرے ہرے لان بہت ہی اچھے ہیں۔ امریکن کروڑپتی صاحب ان پر ریجھ گئے۔ فوراً جیسے کسی نے بٹن دبا دیا ہو، یہ سوال منہ سے نکلا "ایسے لان کتنے میں تیار ہو جائیں گے؟" ساتھ جو پروفیسر صاحب تھے انھوں نے کہا کہ "میں تو علم الانسان کے شعبے کا صدر ہوں، ان تفصیلات سے بالکل ناواقف ہوں، آپ کہیں تو مالی کو بلا دوں۔ آپ اس سے دریافت فرمالیں۔" "بلائیے۔" مالی آیا۔ کروڑپتی صاحب نے کہا "ہم بالکل ایسا ہی لان اپنے یہاں چاہتے ہیں۔ کتنے میں تیار ہو جائے گا؟" مالی نے کہا "صاحب! اس میں کتنے کا کیا سوال ہے، کوڑیوں میں تیار ہوتا ہے، کوڑیوں میں۔ زمین تو آپ کے پاس ہوگی ہی، ذرا اچھی طرح ہموار کرا لیجیے گا، اس پر گھاس جما دیجیے گا۔ جب گھاس ذرا بڑھ جائے تو اسے کاٹ کر اوپر سے رولر پھیر دیجیے گا اور بس۔ یہی کوئی سمجھیے پانچ سو برس کرتے رہیے گا۔ بس ایسا لان تیار ہو جائے گا۔" ہاں تو اسی طرح اگر بچوں کو بالکل آزاد چھوڑ کر کوئی صاحب ان کی صحیح تربیت کرنا چاہیں تو ان بچوں کو کوئی بیس ہزار سال زندہ رکھنے کی تدبیر کرلیں۔ حالات موافق ہوئے اور اللہ نے چاہا تو اس عمر کو پہنچتے پہنچتے خاطر خواہ نتیجہ نکل آئے گا۔ اس وقت تک تو ہمارا خیال یہی ہے کہ بچوں کو مدد کی ضرورت ہے، ہدایت کی ضرورت ہے، ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے، سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کام مشکل

ہے پر صرف سہل کام ہی تو کرنے کے نہیں ہوتے۔ پچھلے دِنوں بچّے کی جسمانی نشوونما، اس کی ذہنی ترقی اور نفسی حالت کے متعلق بہت کچھ چھان بین ہوئی ہے۔ اگر والدین اور استاد اپنے کام کی اہمیت کو سمجھیں اور سوچیں کہ انسان کی تھوڑی سی توجہ سے دُنیا میں کتنی مصیبت گھٹ سکتی ہے اور کتنی خوشی بڑھ سکتی ہے تو وہ ضرور اس تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام سمجھ بوجھ کر انجام دیں۔

اس وقت اس تحقیقات کی تفصیل کا موقع نہیں ہے دِلّی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے آپ اس مضمون پر کچھ نہ کچھ سُنتے ہی رہتے ہیں مختلف عمر کے بچّوں کی صحت کے لیے کیا تدبیریں کرنی چاہئیں، ان کے لیے غذا کون سی مناسب ہے، ان میں سونے جاگنے، کھانے پینے، پیشاب پاخانے کے اوقات کی پابندی کی عادتیں کس طرح ڈالنی چاہئیں - یہ باتیں غالباً آپ اس سے پہلے سُن چکے ہیں، میں تو اس وقت صرف ان ہی گتھیوں کا ذِکر کرتا ہوں جو اکثر والدین اور سرپرست بے جانے اپنے بچّوں کے ذہن میں ڈال دیتے ہیں اور ان میں بھی بس چند موٹی موٹی باتوں کا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ننّھا بچّہ بھی ایک شخصیت رکھتا ہے، وہ کوئی بے جان چیز نہیں، کھلونا نہیں۔ جب لوگ اسے گڑیا سے زیادہ نہیں سمجھتے ہیں تو یہ اسی وقت سے چُپ چاپ اپنے لیے کوئی مقصد، کوئی منزل مقرر کر لیتا ہے اور اُس تک پہنچنے کی برابر کوشش کرتا ہے، ساری دُنیا کو اس

مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے اور اگر اپنے اردگرد کے حالات کو غلط سمجھ کر یہ مقصد مقرّر کر لیا ہے تو ساری دُنیا ہی کو غلط سمجھنا پڑتا ہے۔ اپنے چھوٹے ہونے، کم زور ہونے، بڑے بھائی سے چھوٹے ہونے، یا چہیتے بھائی کی بدصورت بہن ہونے، ماں باپ کے حقیر سمجھنے، غرض طرح طرح کی کمیوں کا اُسے احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس اُس کے تخیل کو حرکت دیتا ہے، وہ اپنی حالت کو سدھارنے اور اپنی حیثیت کو اُبھارنے میں لگ جاتا ہے۔ کمی کا احساس اور اس کی تلافی کی کوشش، یہ دو چیزیں اس کی زندگی کا مرکز ہوتی ہیں، ان میں غلطی ہوتی ہے تو ساری زندگی غلط راہ پر پڑ جاتی ہے۔ ماں، باپ کی طرف سے تربیت کی بنیادی غلطیاں یہ ہوتی ہیں کہ وہ یا تو بچّے میں کمی اور گھٹیا پن کا احساس غیر ضروری شدّت سے پیدا کرا دیتے ہیں یا تلافی کی کوشش میں حائل ہوتے ہیں، اُنھیں غیر معمولی طور پر اُکسا کر غلط راستے پر جانے دیتے یا ڈال دیتے ہیں۔ کمیوں کا صحیح احساس ہو اور تلافی کی مناسب تدبیر، تو بچّے کی تربیت ٹھیک ہو، مگر ان میں زیادتی ہوئی اور توازن بگڑا۔ مثلاً ماں باپ کی بات چیت سے، اُن کے عمل سے، اُن کی سختی، لعنت ملامت سے، اگر بچّے میں اپنے گھٹیا اور کم درجے ہونے کا احساس زیادہ قوی ہو جائے تو وہ اس سے بچنے کی نت نئی تدبیریں کرتا ہے۔ آگے بڑھنا چاہتا ہے، بہتر بننا چاہتا ہے، توجہ اپنی طرف منعطف کرانا چاہتا ہے۔ یہ سب اپنی جگہ پر

ٹھیک ہے، لیکن اگر حدِ مناسب سے بڑھ جائے، تو اسی سے بچے میں کینہ اور حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے اپنے مقابلے والوں کی، بھائی کی، بہن کی، دوسرے بچوں کی بُرائی چاہنے لگتے ہیں۔ اپنی قدر بڑھانے کے لیے دوسروں کی چغلیاں کھاتے ہیں، اُن پر جھوٹے الزام لگاتے ہیں، اُن کے راز فاش کرتے ہیں اور بعض صورتوں میں تو یہ جذبہ مجرمانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ننھے ننھے بچے دوسرے بچوں کو جسمانی نقصان پہنچانے سے بھی نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ماں، باپ اور عزیز، بچے کے آگے بڑھنے کی خواہش کو بے جا طور پر اُبھار کر اس کے حوصلے کی شدت کو اور دوسروں سے بڑھ چڑھ کر رہنے کی خواہش کو مرض کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ اپنے بچے کو درجے کے امتحان میں اوّل نمبر پر دیکھنے کی بے معنی خواہش نہ جانے کتنے بھلے مانسوں سے یہ کراتی ہے۔ اس مصنوعی اُکساوے سے بچے کی ذہنی حالت میں ایک تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جس کو وہ زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتا۔ اس جزوی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جس پر بڑوں نے توجہ جما دی ہے اور جس میں کامیابی سے اُن کی آفرین و تحسین مل سکتی ہے، یہ بچہ اپنی ساری قوت اسی پر صرف کرتا ہے۔ امتحان میں اوّل آتا ہے، بس کتابیں ہیں اور یہ ہے، نہ کھیل کی سُدھ، نہ ورزش کا دھیان، ساری دُنیا تج دی جاتی ہے کچھ دنوں دوسروں کی امیدوں کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے مگر

اُن کی بو جھل اور یک طرفہ توقّعات کا بار اُس کے کم زور شانوں کے لیے ضرورت سے زیادہ ثابت ہوتا ہے، لیکن دوسروں سے داد لینے کا چسکا پڑ جاتا ہے، اس لیے چھوٹی چھوٹی فرضی باتوں میں کامیابی حاصل کرکے اُن کا اشتہار کرتا ہے۔ جب یہ امکان بھی ختم ہو چکتا ہے تو بسا اوقات بالکل نئی راہ امتیاز کی اختیار کرتا ہے کہ بغیر لوگوں کو اپنی طرف متوجّہ کیے اُسے چین نہیں آتا۔ سوچتا ہے، بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ گھر سے غائب رہنے لگتا ہے، مدرسے سے بھاگتا ہے، مار کوٹ ہوتی ہے، اُسے بھی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس جیسی مصیبت میں مُبتلا اور لڑکے بھی ہوتے ہیں، اُن کے گروہ میں جا ملتا ہے، اُن کی سرداری کے لیے مجرمانہ کارروائیوں تک اُتر آتا ہے اور یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ والد صاحب کو سخت اصرار تھا کہ بچّہ اوّل نمبر پاس ہو! لطف یہ کہ اکثر معلّموں، ڈاکٹروں، وکیلوں غرض تعلیم یافتہ باپوں کے بچّے اس مصیبت میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ غالباً اس لیے کہ ان علمائے وقت کو اوّل نمبر پاس ہونے والے بیٹے کا باپ ہونا بہت پسند ہوتا ہے!!

اس کے بالکل مخالف ایک غلطی والدین اور بڑوں سے یہ ہوتی ہے کہ وہ بچے کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں، اپنی بزرگی جتانے کے لیے انھیں بے چارہ بچّہ ہی ملتا ہے: "احمق ہے!" "گدھا ہے گدھا!" "نکمّا ہے، کسی مصرف کا نہیں ہے!" غرض بات بات پر بچّے پر برسے پڑتے ہیں۔ اسے

شرمندہ کرتے ہیں، سب کے سامنے اُن کے عیب گنواتے ہیں، اسے ذلیل کرتے ہیں۔ یہی بچے جن پر بڑوں کی یہ توجہ ہوتی ہے بڑے ہو کر کسی چیز کو اچھا نہیں سمجھتے، ہر ایک کو ٹوکاتے ہیں، نہ کسی کی تعریف کرتے ہیں نہ سُن ہی سکتے ہیں، بچپن میں انھیں ذلیل کیا گیا تھا، اب یہ اس کا بدلا لیتے ہیں اور سب کو بُرا سمجھتے ہیں۔ دُنیا سے اُن کی اَن بن ہوتی ہے۔ بچے کو بچپن میں ذلیل اور مایوس کر کے بُزرگ اُس کی ساری زندگی کو تلخ بنا سکتے ہیں۔

بچپن میں بعض مواقع ایسے آتے ہیں کہ بچے کو اپنی کمیوں کا، دوسروں سے ادنیٰ ہونے کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہی وقت بچے کو سہارا دینے کا ہوتا ہے۔ اس وقت ذرا سی غلطی یا غفلت سے اُس کی نفسی زندگی کو اکثر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ان مواقع کا ذِکر آئندہ کسی موقعے پر کروں گا۔

میری یہ باتیں سُن کر شاید کوئی صاحب فرمائیں کہ یہ عجیب معاملہ ہے، بچے کی ہمت بڑھائیے تو آپ خفا، اُسے بُرا کہیے تو آپ ناخوش، آپ بھی خوب شخص ہیں۔ ہاں! کیا کیجیے، معاملہ کچھ یوں ہی ہے۔ نہ ضرورت سے زیادہ تعریف۔ بچے کے لیے اچھی ہے، نہ بے جا مذمت، نہ اتنا گرایئے کہ پھر قدم ہی نہ اٹھا سکے، نہ اتنا چڑھایئے کہ زمین پر قدم نہ رکھے۔ مختصر سی بات ہے، بشرطے کہ ذہن نشین ہو جائے، بچے کو خدا کا بندہ سمجھیے، نہ وہ آپ کی مِلک ہے، نہ آپ کا کھلونا، آپ کے پاس خدا

اور انسانیت کی امانت ہے۔ اس میں جو صلاحیتیں قدرت نے رکھی ہیں، انھیں نہ بہت اُکسا کر خراب کیجیے، نہ بہت دبا کر، اور ہاں اس بات کا دوسرا پہلو بھی یاد رہے کہ اگر بچّہ آپ کا کھلونا نہیں ہے تو آپ بھی بچّے کا کھلونا نہیں ہیں، آپ بھی خدا کے بندے ہیں، بس ذرا زیادہ تجربہ کار۔ نہ آپ اُس پر ظلم کریں نہ وہ آپ پر، نہ آپ اُس سے کھیلیں نہ وہ آپ سے، دونوں میں ایک دوسرے پر بھروسا ہو، محبّت ہو اور خدا دے تو آپ میں ذرا تھوڑی سی زیادہ سمجھ بس۔

بچّوں کی تربیت

(۲)

(یہ وہ تقریر ہے جو ۸ اپریل ۱۹۳۶ء کو

آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے نشر کی گئی)

کوئی تین ہفتے ہوتے ہیں میں نے آپ سے بچّوں کی تربیت پر کچھ باتیں کی تھیں۔ باتیں بھی کچھ یوں ہی سی تھیں اور زمانہ بھی خاصا گزر گیا۔ اس سے یقین ہے کہ آپ سب کچھ بھول گئے ہوں گے اور میں آج بھی وہی کہتا پھر دُہراؤں تو شاید ہی کوئی پکڑ پائے۔ مگر پاس آغا صاحب کھڑے ہیں، کیوں اس کی اجازت دینے لگے۔ اس لیے کچھ اور ہی کہنا پڑے گا۔ میں نے اُس دفعہ بتایا تھا کہ بچّے کی ذہنی زندگی میں دو چیزوں پر خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے ایک اس کے اس احساس پر کہ وہ اوروں سے کم ہے اور دوسرے اس کمی کو دُور کرنے کے لیے اس کی کوششوں پر۔ ان ہی دو چیزوں سے اس کی ذہنی زندگی کا سانچا بنتا ہے۔ انھی میں اُسے سہارے اور ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں ماں باپ سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ آج

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ غلطیاں عام طور پر خاص خاص موقعوں پر ہوتی ہیں، ماں باپ اُن سے آگاہ ہو جائیں تو شاید ان غلطیوں سے بچنے میں آسانی ہو۔

سب سے پہلے تو ان غلطیوں سے بچنے کی ضرورت ہے جو ماں باپ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ اُنھیں یا تو اپنے بچے کی ان جسمانی خرابیوں کا علم نہیں ہوتا جو وہ ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے، یا علم ہوتا ہے تو وہ ادھر توجہ نہیں کرتے اور ان کمیوں کی وجہ سے بچے کو جو دُشواریاں پیش آتی ہیں اُن کا ذرا خیال نہیں کرتے۔ کتنے بچے ہیں جو آنکھ کی خلقی خرابیوں کی وجہ سے کبھی بلا تکلیف لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ کسی کو دُہرا دکھائی دیتا ہے، کسی کے سر میں پڑھنے سے درد ہونے لگتا ہے۔ یہ بچے جب پڑھنے لکھنے میں اوروں سے پیچھے رہتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کی اصلی مشکل کو حل کیا جائے، اُنھیں بُرا بھلا کہا جاتا ہے سزا دی جاتی ہے۔ بچہ اپنے قصور کو سمجھتا نہیں، سزا کو ظلم جانتا ہے اور اپنے بس بھر اس سے بچنے کی تدبیریں نکالتا ہے، یا اپنی نااہلی کا یقین کر کے محنت اور توجہ سے ہاتھ اُٹھا لیتا ہے۔ آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ بچوں میں بہت بڑی تعداد خلقی طور پر بَیں ہتوں کی ہوتی ہے، آپ کا جی آزمانے کو چاہے تو بچوں کی کسی جماعت سے کہیے کہ اپنے سینے میں پنجہ ڈالو جن بچوں کا بایاں انگوٹھا سیدھے انگوٹھے کے اوپر ہو وہ سمجھیے خلقی بَیں ہتے ہیں۔ یہ طریقہ سو فی صدی سچا نہیں، لیکن تقریباً

ٹھیک نتیجے بتا سکتا ہے۔ ان بے شمار بیں ہتے بچّوں کو رہنا سہنا ہے
دَیں ہتوں کی دُنیا میں! گزر کرنے کو تو کرتے ہی ہیں، لیکن ان کی دشواری
کا کچھ اندازہ کرنا چاہیے اور اُن سے کچھ تو ہمدردی ضروری ہے۔ اگر
آپ ہندُستان سے جہاں سڑک پر بائیں ہاتھ کو بچتے ہیں، جرمنی جائیں
جہاں داہنے ہاتھ کو بچنا ہوتا ہے، تو آپ کو ان غریب بچّوں کی دشواری
کا کچھ اندازہ ہوگا۔ جناب قدم قدم پر کسی نہ کسی سے معافی مانگنی پڑے گی،
یا ڈانٹ سُننی ہوگی۔ اگر آپ خود اپنی موٹر کار چلا رہے ہوں تو خدا جانے
کیا گزرے، مگر اس سے بہت زیادہ مصیبت ان بیں ہتے بچّوں کو
آپ کی دَیں ہتی دُنیا میں اُٹھانی پڑتی ہے، سیدھے ہاتھ سے لکھنا
سِکھایا جاتا ہے، جب اچھا نہیں لکھتے تو بُرا بھلا سُننا پڑتا ہے۔ کیا
تعجب ہے کہ بہتیرے بھلے مانسوں کا خط ایسا خراب ہوتا ہے کہ تحریر
بھی بعض لوگوں کی تقریر کی طرح رازوں کو چھُپانے کا ذریعہ بن جاتی
ہے۔ یہ نہیں کہ یہ بچے کوشش سے سیدھے ہاتھ سے لکھنے کی پوری
مشق بہم نہیں پہنچا سکتے۔ یوں تو بعض مصوّر جو سیدھے ہاتھ سے کام
کرتے تھے خلقی بیں ہتے تھے، مگر ضرورت اس کی ہے کہ دشواری کو
سمجھ کر بچّوں کی ہمّت افزائی کی جائے، اُلٹی ڈانٹ سے اُنھیں
ضد یا کم ہمّتی کا سبق نہ دیا جائے۔ یہی حال آنکھ کان کے بہت سے
نقائص کا ہے۔

پیدائشی نقائص کے بعد بچّے کی آئندہ ذہنی نشو و نما کے لیے خطرے

کا ایک وقت وہ ہوتا ہے جب اُس کا دودھ چھڑاتے ہیں۔ عموماً جس طرح دھوکا دے کر، ڈرا دھمکا کر دودھ چھڑاتے ہیں، ماں اس زمانے میں جس طرح بچے سے چھپی چھپی، الگ الگ، رہتی ہے، وہ بچوں میں ماؤں کی دنیا کی طرف سے ایسی بے اعتباری پیدا کرنے کا سامان ہوتا ہے، جو اکثر ساری عمر ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ماں کی گود اور ماں کا دودھ یہی تو بچے کی ساری لذت و مسرت کی کائنات تھی، اب چالوں سے اُن سے محروم کیا جاتا ہے، تو جس پر بچہ سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا اُس پر شبہہ کرنے لگتا ہے۔ دودھ چھڑانے کے ساتھ یہ ضرورت نہیں کہ ماں بچے سے الگ الگ، دور دور بھی رہے اور اُسے اپنی محبت سے اور اپنی گود کی روح پرور حرارت سے بھی محروم کرنا چاہیے۔ اس زمانے میں تو بچے سے اور زیادہ محبت کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بچہ اپنی زندگی کے اس پہلے انقلابی تجربے کے اثرات پر سے آسانی کے ساتھ گزر سکے۔

ایک اور خطرے کا وقت وہ ہوتا ہے جب بچہ بولنا شروع کرتا ہے۔ بولنا جماعتی فعل ہے اور بولنے کی صلاحیت جماعتی احساس سے فروغ پاتی ہے۔ جو بچے دوسروں سے بے جھجک ملتے ہیں وہ جلد بولنا سیکھتے ہیں، جو ٹھٹکے ٹھٹکے اکیلے رہتے ہیں وہ دیر میں۔ اور بچوں کا یہ ٹھٹکنا اور جھجکنا بے وجہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بھی بھروسے کی کمی ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس زمانے میں بچوں کو ملنے جلنے

کا موقع دیا جائے، اُن کی ہمت بڑھائی جائے، اور خود مختار، بے سہارے رہنے کی عادت ڈالی جائے۔ کھیل کود اور سہل سہل کام کرنے کے موقعے نکالے جائیں تاکہ اُن میں کامیابی سے اُن کی ڈھارس بندھے اور اپنے پر بھروسا بڑھے اور اپنے گھٹیا رہنے کے خیال اور اوروں سے کم رہنے کے احساس پر غالب آسکیں۔ بعض ماں باپ خصوصاً لاڈ پیار اپنے بچوں کے اوپر اتنے خدمت گار مُسلط کر دیتے ہیں اور لاڈ پیار میں وہ اہتمام فرماتے ہیں کہ غریب کو اپنی ضرورتوں تک کے اظہار کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ اظہار سے پہلے ہی کوئی نہ کوئی اُسے پورا کرنے پر آمادہ ملتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ اکثر بہت دیر میں بولنا سیکھتا ہے اور وہ بھی واجبی واجبی۔ بدایوں کے وہ مشہور للا جو خاصی بڑی عمر تک اپنی انّا کی اُنگلی تھامے باہر نکلتے تھے، انھی باثروت کم نصیبوں میں تھے! یہی بات تھی کہ سِن شعور کو پہنچ گئے تھے پر تتلاتے تھے۔ کسی نے پوچھا "میاں صاحب زادے کیا پڑھتے ہو؟" تو شرما کے، چہرہ لال ہو گیا، انّا کے لہنگے سے مُنہ آدھا چھپا لیا اور بولے، جی ہاں بولے "انّا تو ہی ٹھہر دے دیلِ تُل پلتھا ہوں۔"

ہکلانے کی عادت بھی اکثر بلا کسی عضوی خرابی کے بچپن میں اسی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسروں سے تعلق پیدا کرنے میں کسی کمی کے احساس سے، دوسروں کے اُٹکانے سے، ماں باپ کے بُرا کہنے سے، جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گفتگو کے ذریعے

دوسروں سے تعلق پیدا کرنے میں کوئی سہولت پیدا ہو جائے، مثلاً کسی لکھی ہوئی یا یاد کی ہوئی نظم کو پڑھنا ہو اور اس طرح خود سوچنا نہ پڑے اور مخاطب کی طرف سے توجہ ہٹا لینا ممکن ہو تو ہکلانے میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ اکثر ہکلانے والے غصّے میں بالکل نہیں ہکلاتے خوب رواں رواں سُناتے ہیں، عشق و محبت کی خلوتوں میں بھی کہتے ہیں ہکلاہٹ جاتی رہتی ہے! لیکن دوسروں سے تعلق پیدا کرنے کی دشواری کے علاوہ ایک اور وجہ ہکلاہٹ کی عادت پڑ جانے کی یہ ہوتی ہے کہ بچّہ ہمیشہ دوسروں کی توجّہ اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ جو بچّے شروع سے صاف بولتے ہیں اُن کی طرف کوئی توجّہ نہیں کرتا۔ پر جن بچّوں کی بولی میں کوئی نقص ہوتا ہے اُن کی طرف سب توجّہ کرنے لگتے ہیں، اُسے چھیڑتے ہیں، اُس پر ہنستے ہیں، اُس کی نقل کرتے ہیں، ناچار یہ بچّہ بھی اپنی بولی کی طرف زیادہ توجّہ کرنے لگتا ہے، اور اس توجّہ سے بولنا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ بہت سے کام جنھیں آدمی عادت کے طور پر بے تکلّف کرتا ہے، اگر ان کی طرف توجّہ ہو جائے تو ان کا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس بات پر مجھے ایک دوست کا قصّہ یاد آیا۔ یہ ناروے کے رہنے والے بہت بڈّھے آدمی تھے، کوئی ستّر بہتّر کی عمر تھی، کئی سال ہوئے انتقال فرما گئے۔ کہیں گے کہ کاہے پر یاد کیا۔ اُن کی ڈاڑھی بڑی شان دار تھی، ایسی ویسی نہیں، پوری ناف تک،

اور نہایت گھنی، سفید جیسے بُرّاق، ایک دن ریل میں بیٹھے جا رہے تھے، سامنے ایک خاتون بیٹھی تھیں، اور اُن کی آٹھ برس کی لڑکی۔ یہ بچّی پہلے تو کئی منٹ تک ہر نیلز وِن کی طرف دیکھتی رہی پھر ماں کے کان میں کچھ کہا، ماں مسکرا کر چپ ہو رہی، اُس نے پھر ماں سے کہا "پوچھوں؟" ماں چُپ رہی۔ پھر کہا "پوچھوں؟" تو ماں نے کہا "پوچھ" بچّی ہر نیلز وِن کے پاس ادب سے آ کر کھڑی ہوئی اور کہا "دادا ابّا! ایک بات پوچھوں؟" ہر نیلز وِن نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "بیٹی پوچھو" بچّی بولی "دادا ابّا! تم رات کو سوتے وقت یہ ڈاڑھی لحاف کے اندر رکھتے ہو یا باہر؟" غریب دادا ابّا نے بہت سوچا مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں، آدمی سچّے تھے، کہہ دیا کہ "بیٹی یاد نہیں آتا۔" خود بیان کرتے تھے کہ اُس دن دن بھر یہی دھیان رہا، رات ہوئی، سونے لیٹا، تو پہلے ڈاڑھی لحاف کے اندر رکھی، جی گھبرایا، باہر رکھی، پھر بے کلی سی رہی۔ اسی اندر باہر میں تین پہر رات بیت گئی، آخر اُٹھ کر ایک صوفے پر بیٹھا، پیروں پر کمبل ڈال لیا تو آنکھ لگی۔

ہاں تو ہکلے بچّے بھی جب اپنی بولی کی طرف متوجّہ ہو جاتے ہیں تو بولنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے اور کم زور یا کسی کمی کا احساس رکھنے والے بچّوں کو اپنی اس نئی کم زوری میں بڑوں کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کا ایک اور وسیلہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اسی طرح کمی کا احساس رکھنے

والے بچے جب کوئی مثبت طریقہ اپنی کمیوں کی تلافی کا نہیں اختیار کر پاتے تو کچھ کمزوروں کی سیاست سے کام لیتے ہیں اور اوروں کو متوجہ کرنے کی منفی تدبیریں سوچتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کام میں سُستی کرنے لگتے ہیں، بیمار بن بن کر پڑ جاتے ہیں، کھانا نہیں کھاتے، اور کچھ نہیں بن پڑتا تو بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جس غذا کو ماں کھلانا چاہتی ہے اُس سے انکار ہوتا ہے، ماں کی طرف سے خوشامد ہوتی ہے، پھر دھمکیاں، پھر ٹھکائی۔ اُن کا مقصد سب سے حاصل ہوتا ہے، اوروں کو متوجہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ غذا کی طرف سے ہی طبیعت میں ایک روک سی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ بچے کبھی کبھی واقعی بیمار ہو جاتے ہیں۔ بستر پر پیشاب کر دینے کی وجہ بھی عموماً کوئی عضوی خرابی نہیں ہوتی، بچے کا مثانہ اور آنتیں ٹھیک ہوتی ہیں، یہ تو بس ماں باپ یا اُستاد کی توجہ حاصل کرنے کی ایک چال ہوتی ہے۔ اس پر سزا دینے سے ضد، یا توجہ حاصل کرنے کی کامیابی سے ایک غیر عقلی محرک، پیدا ہو جاتا ہے جس کا عمل رفتہ رفتہ عادت بن جاتا ہے۔ اگر ان حالتوں میں طبّی علاج کی جگہ ذہنی علاج کیا جائے یعنی بچے کی توجہ طلبی کو کسی اور طرح تسکین دی جائے، اس کا اعتماد حاصل کیا جائے، اُسے ہمّت دلائی جائے تو یقیناً زیادہ کامیابی ہو، برخلاف اس کے بچے کو اوروں کے سامنے شرمانا بڑی غلطی ہے۔ اس سے بچے میں اپنے اوپر بھروسا اور کم ہوتا ہے اور مرض گھٹنے کی جگہ

بڑھتا ہے۔

پھر بچے کی تربیت کے لیے ایک کٹھن مرحلہ دوسرے بھائی بہن کی پیدائش کے وقت پیش ہوتا ہے۔ جس خاندان میں بہت سے بچے ہوں وہاں سب سے بڑا بچہ ایک عرصے تک اکیلا بچہ ہوتا ہے۔ یہ شرف دوسرے بچوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ جب پیٹھ کا بہن بھائی پیدا ہوتا ہے تو اس بڑے بھائی کو ایسا لگتا ہے کہ اس نوواردنے مجھے تخت سے اُتار دیا اور اس میں ابّا امّاں نے اس اجنبی کی مدد کی، اور مجھ سے بے وفائی برتی۔ اس پر ماں باپ سے اور نوواردسے خفا ہوتا ہے تو کیا بے جا کرتا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی مملکت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے تو کیا تعجب۔ اور یہی ہوتا ہے۔
میں ایک خاندان کو جانتا ہوں اس میں دو بچے ہیں، ایک بھائی ہے، ایک بہن، بہن چھے برس چھوٹی ہے، بھائی کی عمر گیارہ برس کی ہے، باپ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ ہیں، ہمیشہ دورے میں رہتے ہیں۔ شادی کے بعد چار برس بے اولاد گزرے، بڑی دُعاؤں، منتوں، تعویذ گنڈوں اور علاج معالجے کے بعد بچہ پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ ماں کی آنکھ کا تارا تھا، اُس نے جو چاہا وہی ہوا۔ بچے کی ماں لکھی پڑھی سلیقہ مند بی بی ہیں۔ بچے کی معمولی تربیت اچھی ہوئی تھی، تیسرے درجے تک مدرسے میں بھی خوب شوق سے پڑھنے جاتا ہے، سب امتحانوں میں پاس ہوتا تھا۔ اِدھر دو برس سے حال ہی کچھ اور

ہے، ماں کو طرح طرح سے دِق کرتا ہے، مارتا ہے، بال کھینچتا ہے، مہمانوں کے سامنے خاص طور پر بدتمیزی کرتا ہے، کپڑے پھاڑتا ہے، میلا رہتا ہے، اُستاد برابر شکایت لکھ لکھ کر گھر بھیجتے ہیں، آپ سمجھے کہ معاملہ کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ بہن نے اس کی زندگی کا سانچا بدل ڈالا۔ اُس کا آنا ہی اُسے ناگوار تھا۔ جب یہ تین سال کی ہوئی اور اپنے میٹھے میٹھے بولوں سے ماں کا دل لُبھانے لگی، یہ مدرسے میں رہتا اور وہ ماں کی گود میں، باپ بھی دورے سے آتے تو اسی سے باتیں زیادہ کرتے، یہ ناقابلِ برداشت تھا، اب یہ اسے بہن کیسے سمجھتا، اُسے رقیب جانتا ہے، مدِمقابل گردانتا ہے۔ اس کا تخت چھن گیا۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ کوئی تدبیر نہ کرے، اسی تخت کو پھر سے پانے کے لیے یہ طفلانہ جتن کرتا ہے۔ یہ کوششیں بے شک طفلانہ ہیں، آپ کا جی چاہے ان پر ہنسیے مگر اس کے دل سے پوچھیے اسے یہی تدبیر آتی ہے اسی بدتمیزی سے ماں باپ کو، بے وفاؤں کو، اپنی طرف متوجّہ کرتا ہے۔ اُستادوں کی خراب رپورٹوں سے خوش ہوتا ہے، اس لیے کہ ایک مرتبہ کسی اُستاد نے کہہ دیا تھا کہ "تم پڑھتے لکھتے نہیں ہو، ہم تمھارا نام کاٹ دیں گے، تم گھر ہی پر پڑھا کرو۔" اس سے امید ہو گئی ہے کہ مدرسے سے نجات پا کر گھر رہ سکوں گا تو دن بھر وہ رقیبہ ماں پر قابض نہ رہ سکے گی۔ غرض اس بچے نے اپنی ساری زندگی اسی ایک خیال پر منحصر کر دی ہے۔ لیکن کیا یہ سب ضروری اور لازمی ہے؟ نہیں۔

اگر ماں بڑے بچّے کو چھوٹے کی آمد سے پہلے اس واقعے کے لیے تیار کرے تو اس میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے۔ پھر رقابت کے اس امکان کا خیال رہے تو یہ اپنی اس محرومی کو اس درجہ محسوس نہ کرے۔ سلیقے والی ماؤں کے لیے یہ ناممکن نہ ہونا چاہیے کہ وہ اس بڑے بچّے کے لیے، اس واقعۂ پیدایش کو حریف کی ولادت کے حادثے کی جگہ واقعی بھائی، دوست ساتھی کی آمد کا مبارک موقع بنا دے۔

زیادہ بچّوں والے خاندان میں اس بات سے بھی عموماً بچّوں کی ذہنیت پر بڑا اثر پڑتا ہے کہ ان کا مرتبہ ان بچّوں میں کیا ہے؟ عموماً سب سے چھوٹا بچّہ یا تو سب سے تیز ہوتا ہے یا بالکل نکمّا۔ وجہ صاف ہے، یہ سب سے کم ہوتا ہے۔ اس لیے سب سے بڑھنا چاہتا ہے۔ اگر صلاحیت ہے اور حالات موافق ہیں تو تیزی سے بڑھتا ہے اور سب پر سبقت لے جاتا ہے۔ اگر قوتیں، حوصلے کا ساتھ نہیں دیتیں تو بالکل شل ہو کر مایوسی سے کندھا ڈال دیتا ہے۔ سب سے چھوٹے بچّے کے لیے یہ خطرہ بھی ہے کہ کچھ نہ ہو اور یہ امکان بھی کہ سب کچھ ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں سب سے بڑا بچّہ عموماً قوت کا پرستار، جبر کا حامی، حکومت اور قانون کا ساتھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اُس نے اقتدار کا مزہ چکھا ہے اور جب دوسرے بچّوں کی پیدایش نے اس سے یہ اقتدار کچھ چھینا تو وہ اس وقت سے اُسے اور بھی قیمتی سمجھنے لگا ہے۔

ماں باپ اگر ان موقعوں پر جن کا ذکر میں نے کیا ہے زرا ہوشیاری سے کام لیں تو بچے کی زندگی میں بہت سے پیچ نہ پڑنے پائیں۔ ضرورت ہے محبّت کے ساتھ تھوڑی سی سمجھ اور تھوڑے سے علم کی، اور ہاں صبر کی۔ محبّت تو کہتے ہیں ماں باپ کو بچّوں سے ہوتی ہی ہے، مگر یہ آخری تین چیزیں ذرا کمیاب ہیں!

بچّوں کی تربیت

(۳)

(یہ وہ تقریر ہے جو ۲۶ راپریل ۱۹۳۶ء کو
آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے نشر کی گئی)

آپ کو یاد ہو یا نہ ہو اس سے پہلے "بچّوں کی تربیت" پر آپ سے دو بار باتیں کر چکا ہوں۔ ریڈیو کا انتظام کچھ ایسا ہے کہ بس آدمی اپنی سناتا ہے، دوسرے کی نہیں سُنتا۔ مگر ابھی اللہ رکھے ڈاک کا محکمہ سلامت ہے اس لیے یہاں سے پندرہ منٹ باتیں کر کے جلیئے تو یہ نہیں کہ بات آئی گئی ہوئی۔ تیسرے ہی دن سے خط آنا شروع ہو جاتے ہیں اور عجیب عجیب بھانت بھانت کے۔ بہت سے تو جھوٹ موٹ کی تعریف لکھ بھیجتے ہیں، بعض کسی چھوٹی سی بات کا مثلاً یہ کہ دو لفظ آپ نے ایسے بول دیے، جو ان کی سمجھ میں (جس کے لیے کوئی پیمانہ نہیں) نہیں آئے۔ خفا بھی ہوتے ہیں۔ بہت سے لکھتے ہیں کہ اب کے بار یہ بات ضرور کہیے گا، یہ بات ضرور بتائیے گا اور ہاں یہ تک کہ جی چاہے تو ہمارا نام بھی لے دیجیے گا۔ تو جناب سُنیے! حضرت آپ سے عرض

ہے کہ جنھوں نے یہ خط لکھے تھے ان سب کا جواب دینا تو میرے بس کی بات نہیں، تعریف کرنے والوں کا شکریہ، خفا ہونے والے صاحب کا بھی شکریہ۔ یہ مجھے یقین ہے یا سمجھیے کہ میں دیکھ رہا ہوں، کہ ان میں سے ایک صاحب تو اس وقت بھی اپنے رسیور کے پاس بیٹھے اس کی ایک گھنڈی کو گھما گھما کر میری آواز کو، کہ پہلے ہی سے بہت اچھی نہیں، اور خراب کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو لفظ ان کی سمجھ میں نہ آئے وہ کم سے کم بہت زور سے تو ضرور بولا جائے۔ خدا بخشے علی گڑھ کے مشہور اُستاد مولوی عباس حسین صاحب کو، فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! قرأۃ کا فن ختم ہوگیا، ختم۔ میرے اُستاد مرحوم اس کے آخری جاننے والوں میں تھے۔ فرمایا کرتے کہ اگر "ق" کا صحیح تلفظ مٹکے کے اندر کردوں تو مٹکا پھٹ جائے۔ تو جناب بٹن گھمانے والے صاحب! آپ سے گزارش ہے کہ میں تو اپنے دیس کے لوگوں کی سیدھی سادی زبان بولتا ہوں، اس میں ع، ق کہیں کہیں آجاتا ہے تو اسے حرام نہیں سمجھتا، نہ آپ کو ایسا سمجھنا چاہیے۔ میرا تو تلفظ بھی ہندی ہے، گر پھر بھی کسی "ق" کا تلفظ کچھ بھی صحیح ہوگیا تو آپ کے سٹ کا بلب تو پھٹ ہی جائے گا۔ بس بات سنیے اور ایک ایک لفظ کے پیچھے نہ پڑیے۔ اللہ نے چاہا آپ کی سمجھ میں بھی آجائے گا۔ ہاں! جن صاحبوں نے مشورے بھیجے ہیں ان کا سب سے زیادہ شکریہ! وہ اب سنیں ان کے مشوروں پر بہت کچھ عمل کیا ہے چاہے اس میں وہ حیدرآباد والے

صاحب خوش ہوں یا جھانسی والے دوست، بمبئی والے بھائی یا ڈھاکے والے بزرگ کہ ہمارے مشورے پر عمل ہو رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ سب پر ہے اور خود بھی یہی کہنے کا ارادہ تھا۔ یعنی کیا ؟ لیجیے سُنیے۔

میں نے پچھلی گفتگو میں یہ بتایا تھا کہ بچے کی شروع زندگی میں بعض خاص خاص وقت ایسے ہوتے ہیں، جب اس سے اپنے آس پاس کے حالات یا ارد گرد کے لوگوں کے سمجھنے میں چوک ہو جاتی ہے۔ اور چوں کہ وہ بے چارہ تو اسے چوک جانتا ہی نہیں، اس لیے اسی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اُٹھائے چلا جاتا ہے۔ بنیاد کی اینٹ کی ٹیڑھ اوپر تک جاتی ہے اور یہ ہمیشہ اس کو بھگتنا ہے مثلاً میں نے بتایا تھا کہ جب بچے کا دودھ چھڑاتے ہیں، جب بچہ کچھ باتیں کرنا شروع کرتا ہے، جب کسی سخت بیماری سے اٹھتا ہے، جب کبھی کوئی بھائی بہن پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ انھیں کٹھن وقتوں میں سے پہلے پہل مدرسے جانے کا وقت بھی ہے۔ بچہ جب مدرسے جاتا ہے تو یوں سمجھیے کہ ایک نئی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ زندگی کی سڑک کے وہ موڑ جہاں بڑی ہوشیاری اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے اور جہاں ٹکرا کر نقصان اُٹھا جانے کا بڑا ڈر ہے، ان میں سے ایک سخت موڑ مدرسہ بھی ہے۔ جس طرح دوسرے کسی موڑ کے لیے بچے کو تیار کرکے اور اس کی شکل کو سمجھ کر خطرے کو بہت کچھ گھٹایا جا سکتا ہے، اسی طرح اس موڑ یعنی مدرسے کے لیے بھی بچے کو تیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر پہلے سے بچے کو

دوسروں سے ملنے جلنے کی عادت ہو، اگر وہ پہلے سے اپنے اوپر بھروسا کر کے آپ اپنا تھوڑا بہت کام کرنا سیکھ چکا ہو، اگر استادوں کے پاس جانے سے پہلے ماں باپ کی محبت اور توجہ میں، اپنے بھائی بہن کو شریک بنانا جان گیا ہو اور اس سے دل برداشتہ نہ ہوا ہو تو شاید مدرسے کی دُنیا اسے اتنی نرالی نہ معلوم ہو جتنی کہ اکثر ہوتی ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اکثر اس قسم کی تیاری نہیں کرائی جاتی۔ بلکہ مدتوں پہلے سے بچے کو مدرسے بھیج دیے جانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ مدرسے سے ہوّے کا کام لیا جاتا ہے "خبردار! ایسا کرو گے تو مدرسے بھیج دیے جاؤ گے" ابا جی فرماتے ہیں۔ اماں کہتی ہیں "دیکھو، یہ کام کرلو، ورنہ مدرسے بھیج دوں گی"۔ بچے کا تخیل اس ڈراؤنی جگہ کا جو تصور اپنے اندر قائم کرتا ہوگا، وہ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہاں پہنچنے پر وہ اس جگہ سے آسانی کے ساتھ راضی ہو جائے۔

لیکن اگر بہتیروں کے لیے اس نادانی سے مدرسے جانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا کام کٹھن ہو جاتا ہے تو ایسے بچے بھی ضرور ہوتے ہیں اور اچھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں جن کے گھر کی تربیت ٹھیک ہوتی ہے اور وہ جب مدرسے جاتے ہیں تو اس مہم کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ مگر کیا کہیے کہ مدرسے پہنچ کر ان کا رنگ بھی کچھ بدل جاتا ہے اور ان کی تربیت میں بھی ایسی گتھیاں پڑ جاتی ہیں، جو عمر بھر سلجھائے نہیں سلجھتیں۔ ہمیں ان دونوں قسم کے بچوں پر نظر ڈالنی چاہیے۔

آیئے پہلے انھیں لیں جو گھر سے اچھے خاصے آتے ہیں۔ مدرسہ ان کے لیے ہوّا ابھی نہیں ہوتا اور گھر کی تربیت سے وہ کوئی ایسا عیب بھی ساتھ نہیں لاتے جسے نہ جاننے کی وجہ سے مدرسے والوں سے بچّے کے سمجھنے اور اس کی مدد کرنے میں کوتاہی ہو۔

ان بچّوں کی تربیت میں سب سے پہلے تو مدرسے کے عام نظم اور ڈسپلن اور اس ڈسپلن کی سختی سے اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ بچّے جب مدرسے آتے ہیں تو سب تن درست بچّوں کی طرح کھیلنے کودنے ہنسنے بولنے کی جبلّتیں ساتھ لاتے ہیں، لیکن یہاں کا ڈسپلن انھیں گھنٹوں خاموش، بے ہلے ڈُلے بیٹھنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ جبریہ نیکی ان بچّوں کو بھلا کیسے بھا سکتی ہے۔ مگر زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ مدرسہ ان کے لیے ایک مندر ہو جاتا ہے، جس میں ڈسپلن کے اس بے سمجھ اور ظالم دیوتا کی پوجا اس کے ظالم پجاری اُستاد، اس سے مجبوراً کراتے ہیں۔ وہ اس بے معنی ظلم کا مطلب نہیں سمجھتا، نہ کوئی اسے سمجھاتا ہے۔ اس ظالم دیوتا کی عبادت میں، یا تو اس کی طبیعت کا اصلی ولولہ ختم ہوتا ہے، جی بجھ جاتا ہے اور یہ بھی اور کمزوروں، ذلیلوں، دبنے والوں کی طرح ہوتے ہوتے اس کا عادی ہو جاتا ہے یا پھر اس سے بچنے کے جو طریقے سوچتا ہے اور ظلم کو ظلم جاننے کے بعد اس سے نجات کی جو راہیں نکالتا ہے، وہ ایسی ہوتی ہیں کہ ہمیشہ کے لیے اس کی تربیت کے درست ہونے کی راہ بند سی

ہو جاتی ہے۔ اچھے اُستاد بچوں کی فطری خواہشوں کو مارے بغیر اور ان پر بے جا سختی کیے بن، ان میں اس کی عادت ڈال دیتے ہیں کہ ہر بچہ دوسرے کے حق کا خیال رکھے، اپنی خود غرضی کو جماعت اور مدرسے کے لیے دبانا سیکھے اور دوسروں کے خیالوں اور ضرورتوں کی عزّت کرنا جانے۔ مگر اچھے استاد کم ہوتے ہیں اور اکثر کو ڈسپلن میں بے جا زیادتی ہی ٹھیک راہ نظر آتی ہے۔ ان استادوں میں بہتیرے غریب ایسے ہوتے ہیں کہ عمر کا ابتدائی زمانہ ماں باپ کی مار کھاتے اور استادوں کی ڈانٹ ڈپٹ سہتے کٹا، اب حکومت کا موقع ملا ہے، تو دل کھول کر حکومت چاہتے ہیں اور یہ مرض کچھ ایسا ہے کہ جوں جوں حکومت کا موقع بڑھتا ہے، یہ مرض بھی بڑھتا ہی جاتا ہے۔ بہتیرے ایسے ہوتے ہیں کہ سستی اور کاہلی کی وجہ سے، ولولہ اور ذوقِ عمل کی کمی سے، بس یہی اچھا سمجھتے ہیں کہ کام ایک ڈھرّے پر پڑے، کون ہر وقت نئی نئی باتیں سوچے اور نئے نئے مسئلے حل کرے۔ یہ ڈرتے ہیں کہ لڑکوں میں اُپج اور آزادی کو بڑھایا تو ہر لمحے نئی تدبیریں کرنی اور نئی راہیں نکالنی ہوں گی اور اس کا دماغ کہاں، اس مصیبت میں کوئی کیوں پڑے۔ لڑکے وقت پر آئیں، وقت پر جائیں، چُپ چاپ بیٹھے سُنیں اور یہ جیسے تیسے نصاب ختم کرا دیں اور رجسٹروں کے کام انجام کر دیں اور ترقی کے لیے ہیڈ ماسٹر صاحب کی سفارش حاصل کریں۔ بس اللہ اللہ خیر سلّا۔ سچ ہے مشین بننا سہل ہے، آدمی رہنا مشکل ہے! اسی طائفے

میں وہ اُستاد بھی ہوتے ہیں جنھیں اپنے اوپر بھروسا نہیں ہوتا، وہ ہر وقت ڈرتے ہیں کہ بچوں کے کام میں ذرا ڈھیل کی اور یہ قابو سے نکلے۔ انھیں احساس تو ہوتا ہے اپنی کمیوں کا اور بچوں میں ایک مخالف قوت کا ہوتا دیکھ کر ڈرتے رہتے ہیں۔ بچوں پر ان کا ظلم دراصل اسی ڈر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ استاد اچھی تربیت کے دشمن ہیں اور جن مدرسوں میں یہ صاحبان کارفرما ہیں ان میں جس دن اچھی تربیت کا انتظام ہو جائے گا اس دن چراغتے کا بیج بو کر نے شکر کی فصل بھی کاٹی جانے لگے گی! اللہ کا شکر ہے کہ تعلیمی کام کرنے والے اب ڈسپلن کی حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں اور شاید وہ وقت جلد آئے گا کہ مدرسے کا ڈسپلن بھی ہر سچے ڈسپلن کی طرح خود بچوں کے ارادے پر مبنی ہو، اور ان کی قدرتی صلاحیتوں کے کاڑھنے کا وسیلہ بنے، نہ کہ انھیں مارنے کا آلہ۔

ظاہری ڈسپلن کے بھوت کے بعد مدرسوں کا رائج نصاب بھی بچوں کی تربیت ٹھیک نہیں ہونے دیتا۔ آدمی کی تاریخ پر نظر ڈالیے اس کی بڑی بڑی محرومیاں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ یہ جن چیزوں کو پہلے کسی کام کا ذریعہ بناتا ہے، ہوتے ہوتے اسی ذریعے کو خود اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ وسیلہ قریب ہوتا ہے اور مقصد دور، بس وسیلہ ہی نظر میں رہ جاتا ہے، مقصد اوجھل ہو جاتا ہے۔ محرومی کی اسی داستان میں مدرسے کا انتظام بھی ایک باب ہے۔ اس نے مدرسے اپنی آنے والی

نسلوں کی ذہنی تربیت کے لیے بنائے۔ اس تربیت کے لیے سماج نے اپنی بنائی ہوئی ذہنی چیزوں کو ذریعہ بنایا اور ٹھیک بنایا، پر ہوتے ہوتے یہ ذریعے خود مقصد بن گئے۔ زبان، ادب، تاریخ، حساب، دینیات یہ سب اس لیے مدرسوں میں پہنچے کہ بچے کی تربیت کا ذریعہ بنیں۔ اب وہاں حکمراں ہیں، بچہ محکوم ہے۔ بچہ وہاں اس لیے جاتا ہے کہ ان کا بوجھ اٹھائے، اس لیے نہیں کہ یہ بچے کا بوجھ ہلکا کریں۔ اب کوئی نہیں دیکھتا کہ ان ذریعوں سے ذہن کی تربیت ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ یہ ذریعے تو نصاب کی "لال کتاب" میں درج ہیں، انھیں کون چھیڑ سکتا ہے۔ ان کے استعمال سے استادوں کو تنخواہ ملتی ہے، مدرسے کو امداد ملتی ہے۔ یہ کون دیکھے کہ ان مضامین کے انبار تلے کتنے ہونہار ذہن گھُٹ گھُٹ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ عمر بھر تعلیم اور تربیت کا کام کرتے ہیں، پر یہ سوچنے کا موقع کسے ملتا ہے کہ بھلا ذہن کی تربیت ہوتی کیسے ہے؟ حالاں کہ صاف سی بات ہے۔ جسم کی طرح، کہ مختلف حالتوں میں، مختلف غذاؤں سے پلتا اور بڑھتا ہے، آدمی کا ذہن بھی ان چیزوں سے پلتا بڑھتا ہے اور اپنی قدرتی طاقتوں کو ترقی دیتا ہے، جو اس سے پہلے سماج میں دوسرے آدمیوں نے اپنی ذہنی محنت سے بنائی ہیں۔ ان چیزوں میں زبان و ادب بھی ہے، رسم و رواج بھی، فنونِ لطیفہ بھی ہیں، عمارات بھی، آلات بھی ہیں، اوزار و صنعت بھی۔ غرض سب کچھ، جس کو اگلوں کی ذہنی کاوش نے کوئی ایسی شکل دے دی

ہے، جو اس تک پہنچائی جا سکتی ہے، وہ سب اس کی ذہنی تربیت کے لیے حاضر ہے اس لیے کہ بنانے والے کے ذہن نے اس میں اپنی جو جو قوتیں بند کی ہیں، سُلا دی ہیں، وہ جب اس بچّے کے ذہن میں آ کر کھلتی ہیں، جاگتی ہیں، تو اس سے اس کی تربیت ہوتی ہے۔ یاد رکھنے کا نکتہ یہ ہے کہ تربیت کے خوان پر جو بے شمار غذائیں چُنی ہیں ہر ذہن ان سب کو کھا کر نہیں پنپ سکتا۔ بعض اسے راس آتی ہیں، بعض نہیں اور یہ کیوں؟ یوں کہ ان چیزوں میں جو جو قوتیں چھپی ہیں، جو طاقتیں سوئی ہوئی ہیں، وہ جس ذہن کا پرتو ہیں، اس میں اور اس بچّے کے ذہن کی قدرتی ساخت میں کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور ہونی چاہیے۔ اس موافق مزاج شبنم سے بچّے کے ذہن کی کلی کھلتی ہے اور پھر ساری زندگی کو اپنی خوشبو سے معطّر کر دیتی ہے۔ اسی مناسبت رکھنے والے دیے سے اس بچّے کے ذہن کا دیا بھی روشن ہوتا ہے، جو پھر سنسار کے اندھیارے میں ہر تاریک گوشے کو اُجاگر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ اُجالا ہر ذہن کا حق ہے پر ہر ایک کو یہ حق ایک ہی طرح حاصل نہیں ہوتا۔ کسی کو یہ روشنی کہیں سے ملتی ہے، کسی کو کہیں سے۔ کسی کا ذہن ادب سے تربیت پاتا ہے تو کسی کا ریاضی سے، تو کسی کا کھلونوں اور آلات سے۔ ادب والے کے ذہن کو آلات سے اور آلات والے کو شعر سے تربیت دینے کی کوشش کرنا بس تربیت کی ماہیت ہی سے بے خبری ہے۔ مدرسے کا کام یہ ہے کہ بچّوں کی ذہنی ساخت کا اندازہ کر کے، اس چیز یا ان

چیزوں سے، اس کی تربیت کا انتظام کرے، جو اس کے مناسب حال ہوں، ورنہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ غلط کوششیں بے کار اور بے سود ہی نہیں ہوتیں، بلکہ ان چیزوں میں ناکامی سے، جس سے بچے کو کوئی مناسبت نہیں، پر جس کا جُوا اس کی گردن پر خواہ مخواہ رکھا ہوا ہے، مایوس اور دل برداشتہ ہو کر اور ماسٹر صاحب قبلہ کے نمبروں اور ریمارکوں اور ماں باپ کی مایوسی بھری تنبیہوں سے اپنی کمیوں کا یقین کر کے، کتنی غیر معمولی صلاحیتوں کا خون روز ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اگر اُستاد کامیاب کوشش کے جادو اور بانتیجہ کام کے طلسم سے واقف ہوں، جو بظاہر غبی بچوں تک کو دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے، تو محض نصاب کی رسمی پابندی سے یوں صلاحیتوں کا خون نہ کریں۔ وہ دن دُنیا کے لیے بڑا مبارک دن ہوگا جب اس کے مدرسوں میں اُستاد یہ سمجھ لیں گے کہ وہ کسی ایسے کارخانے کے کام کرنے والے نہیں ہیں، جس میں سے سب مال ایک ہی ٹھپے اور ایک ہی مار کے کا نکلنا ضروری ہے، بلکہ جو مختلف قسم کی صلاحیتیں اُن کی امانت میں دی جاتی ہیں انھیں درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد دینا ان کا سب سے بڑا فرض ہے۔

ان بنیادی غلطیوں کے علاوہ مدرسے میں اُستادوں سے بعض اور غلطیاں ایسی ہوتی ہیں، جن سے بچے کی تربیت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ ان میں ایک بہت ہی عام غلطی طرف داری اور ناانصافی کی ہے بچے

جب استاد کی بے جا طرف داریاں دیکھتے ہیں، تو ان پر بڑوں سے بہت زیادہ اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ ابھی قدرتی زندگی سے قریب ہوتے ہیں اور دنیا کی بے انصافیوں کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے انھیں اپنی سادگی میں یہ چیز بہت کھلتی ہے اور چوں کہ اُستاد ان کے لیے بڑوں کی دنیا کا ایلچی ہوتا ہے، اس لیے اس پر سے بھروسا اٹھا اور یوں سمجھیے سب بڑوں کی انصاف پسندی کا پول ان کی نظر میں کھل گیا۔ بچے استادوں کی طرف داری، نا انصافی اور تعصب کا ایسا گہرا اثر لیتے ہیں کہ یہ اکثر عمر بھر ان کے ذہن سے نہیں ہٹتا اور مدرسے کے بہت سے دوسرے اچھے اثرات اس احساس کی وجہ سے مٹ جاتے ہیں۔

پھر سزا کے معاملے میں اُستاد سے ایسی غلطیاں ہوتی ہیں کہ صحیح تربیت کا مقصد بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ سزا کی اگر کوئی تعلیمی اور تربیتی حیثیت ہے تو بس یہ کہ یہ کفارے کی صورت ہے، جس سے ضمیر کی کھٹک رفع ہو جاتی ہے، اس لیے سزا کو کبھی ڈرانے دھمکانے کا ذریعہ نہ ہونا چاہیے، احساسِ جُرم سے نجات دلانے کا وسیلہ ہونا چاہیے، ورنہ یہ تربیت کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ سچی اور مفید سزا اسی وقت ممکن ہے کہ بچے کو اپنے قصور کا احساس ہو جائے، اس پر افسوس اور ندامت پیدا ہو اور اس کے دل میں آپ ہی کفارہ یا تلافی کا خیال آئے ورنہ سزا ڈراوا ہے، علاج نہیں۔ اور جسمانی سزا چوں کہ عموماً کفارے کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی اس لیے تربیت کے لیے

اکثر بے سود بلکہ مضر ہوتی ہے۔ جسمانی سزا معمولاً بچوں میں ذلت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ کسی کو ذلیل کر کے اس کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو ابھارا نہیں جا سکتا۔ پھر یہ جسم کو تکلیف دیتی ہے اور جسم کا دکھ بالکل میکانکی طور پر ہماری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور نفس کی تمام قوتوں کو مدافعت کے لیے آمادہ کر دیتا ہے۔ مدافعت کا یہ خیال سزا کے گزر جانے کے بعد بھی مخالفت کے روپ میں رہتا ہے، اور اس طرح سزا کی غرض ہی فوت ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی اور بہت سی غلطیاں مدرسے میں ہوتی ہیں، جن سے بچے کے ذہن کا سانچہ غلط بناوٹ اختیار کر لیتا ہے اور پھر ساری زندگی کو اس غلطی کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔

یہ سب مصیبتیں تو سب بچوں پر یکساں آتی ہیں، پر ان کا کیا حال پوچھیے جن کے لیے گھر کی تربیت کی خامیاں مدرسے کو بالکل جہنم بنا دیتی ہیں۔ ان بچوں میں مدرسے سے زیادہ تکلیف تین قسم کے بچوں کو ہوتی ہے۔ ایک تو گھر کے لاڈلوں کو جنھیں کبھی اس کا موقع نہیں ملا کہ اپنا کوئی کام آپ کر لیتے، دوسرے بچوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتے، مارتے تو پٹتے بھی، کہتے تو سنتے بھی۔ ہمیشہ ان کا کہا مانا گیا۔ انھیں کھانا کسی اور نے کھلایا، کپڑے کسی اور نے پہنائے، منہ ہاتھ تک خود دھونے کی نوبت نہ آئی، کبھی اکیلے سوئے نہیں، غرض وہی مرزا پھویا۔ دوسرے مدرسے میں ان بچوں کو بڑی دشواریاں ہوتی ہیں جو گھر پر محبت اور پیار کو ترستے ہیں، سوتیلی ماؤں کے ہاتھوں

تکلیفیں اُٹھاتے ہیں، جن سے نئی ماں نے آیا جان کی محبت بھی چھین لی اور انسانیت پر سے ہمیشہ کے لیے ان کا بھروسا اٹھا لیا۔ تیسرے وہ بچے ہیں، جن میں کوئی جسمانی نقص ہوتا ہے۔ جن بچوں میں جسمانی نقص ہوتے ہیں ان کی تربیت کی دشواریوں پر میں پچھلی دفعہ کچھ کہہ چکا ہوں۔ یہ دشواریاں مدرسے جاتے وقت اور بڑھ جاتی ہیں۔ اکثر مدرسوں میں طلبا کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایسے نقائص کی طرف کوئی دھیان نہیں کرتا۔ پھر اگر یہ نقص چہرے کو یا جسم کو بدنما کرتا ہے تو اس پر دوسرے بچے نادانی میں ہنستے ہیں، بے چارا مریض کڑھتا ہے اور اس مخالفوں کی دنیا سے بے زار رہتا ہے۔ یہ جتنا گھبراتا ہے، دوسرے اُتنا ہی اور چھیڑتے ہیں اور آپس میں صحیح ربط پیدا ہونے کی راہ بند ہی ہوتی جاتی ہے۔ اگر نقص آنکھ، کان کا یا کوئی چھپا ہوا نقص ہے تو عرصے تک کوئی پوچھتا نہیں۔ مگر اس سے بچے کی پڑھائی پر اثر پڑتا ہے۔ وہ پھسڈی شمار ہونے لگتا ہے، ڈانٹ سنتا ہے، ذلت سہتا ہے اور یوں اس کے ذہن میں ان تمام برائیوں کے پیدا ہونے کا سامان ہوتا جاتا ہے، جو کمیوں کے شدید احساس کے ساتھ پیدا ہوتی اور زندگی کو غلط راستے پر ڈال دیتی ہیں۔

محبت کو ترسے ہوئے بچے دنیا کی طرف سے یوں ہی بے اعتباری رکھتے ہیں۔ چنان چہ اس نئی دنیا میں بھی ہر چیز کو شبہے سے دیکھتے ہیں اور یہاں ہوتی بھی کچھ ایسی نفسی نفسی اور بے تعلقی ہے کہ محبت کی وہ بھوک

جو یہ ساتھ لائے ہیں یہاں بھی اور تیز ہی ہوتی ہے اور اس کے علاج کرنے کا سامان نہیں ہوتا اور یوں ان کی ذہنی گتھیوں میں اضافے ہی کا ڈر بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف مدرسے میں لاڈلے میاں اور مرزا پھویا کو ہوتی ہے۔ یہ عادی تو ہیں اس کے کہ سارا گھر ان کی خدمت میں کھڑا رہے، پہنچے شامت کے مارے مدرسے میں کسی نے دھپ جمائی، کسی نے دھکا دیا، کسی نے مُنہ چڑایا، لگے رونے تو سب ہنسے۔ ماسٹر صاحب آئے تو یہ سمجھے کہ ابّا جان کی طرح بس ہیں ہی گود میں اُٹھالیں گے۔ ماسٹر صاحب غریب کے ذمّے شیطانوں کی ایک پوری فوج، انھیں اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل۔ انھوں نے بات بھی نہ پوچھی، بس صاحب زادے کا تعلق پہلے دن سے مدرسے سے خراب ہو گیا اور جس طرح پہلے بتا چکا ہوں اس غلط خیال پر ساری آئندہ زندگی کی عمارت کھڑی ہونے لگی۔ لیکن کیا ان سب مصیبتوں کا کوئی علاج نہیں؟ ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہیں ہے۔ دنیا کا مرکز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حماقت پر آ جما ہے۔ مدرسے کی ماہیت کو بدلوانے کی کوششیں جاری ہیں مگر کون سُنتا ہے۔ نصابِ تعلیم کے ظلم پر سمجھنے والے روتے ہیں، مگر جن کے ہاتھ میں نظام ہوتا ہے وہ اسے باؤلوں کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ بچّے تباہ ہوتے ہیں، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ جانوروں کی طرح بچّوں کو اُستاد مارتے ہیں، کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ بہتیرے بچّوں پر مدرسے میں جو روحانی اور جسمانی

تکلیف گزرتی ہے اس کا حال انھیں کا دل جانتا ہے۔ حال میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا، سوئٹستان کے ایک معلّم Willi Schohaus کی لکھی ہوئی The Dark Places of Education- اس نے کوئی ۸۷ مشہور آدمیوں کے بیانات درج کیے ہیں کہ ان پہ مدرسے میں کیا گزری۔ پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ مدرسہ کسی سخت ظالم کی ایجاد ہے۔ اس کے مصائب کی یاد عمر بھر دل سے نہیں مٹتی۔ مگر اس مایوسی میں بس ایک امید کی کرن ہے۔ وہ یہ کہ اگر مدرسے میں ایک اچھا استاد پہنچ جائے تو اس ظلمت کدے کو جگمگا دیتا ہے۔ بے جان احکام اور معائنے، رجسٹر اور ڈائریاں سب پڑی رہ جاتی ہیں اور یہ اپنی شخصیت کے جادو سے مُردوں کو زندہ اور زندوں کو زندہ تر کر دیتا ہے۔ بچوں کی اُجاڑ دنیا بس جاتی ہے اور طبیعت کی پژمردہ کلی کھلنے لگتی ہے۔ مگر آپ کہیں گے کہ اچھے استاد ہوتے کہاں ہیں "یافت می نہ شود جستہ ایم ما۔" جی ہاں! سچ ہے یہ کم یاب ضرور ہیں مگر نایاب نہیں۔ مجھے بعض اچھے استادوں کے ساتھ کام کرنے کا فخر اور شرف حاصل ہے، اس لیے میں تو مایوس نہیں۔ آئندہ کسی صحبت میں عرض کروں گا کہ یہ اچھے استاد ہوتے کیسے لوگ ہیں۔ بس اب رخصت۔

ننھّا مدرسے چلا

(یہ وہ تقریر ہے جو ۲۱ مئی ۱۹۴۲ء کو
آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی)

لیجیے اب آپ کا ننھّا مدرسے چلا۔ آدمی کا بچّہ شروع شروع میں ایسا بے بس ہوتا ہے اور بڑا ہو کر آدمیت کے جس مرتبے پر اُسے پہنچنا ہوتا ہے، وہ اتنا بلند ہے کہ اس کی تعلیم میں بہت دن لگتے ہیں اور اس کی تربیت کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اس تعلیم و تربیت کے کام میں آپ یعنی ننھّے کے ماں باپ، سرپرست، اکیلے جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے۔ اب شاید آپ سمجھتے ہیں کہ کام خالی آپ سے نہ سنبھلے گا، اس میں اوروں کی مدد درکار ہے، اس لیے ننھّا مدرسے بھیجا جاتا ہے لیکن تعلیم و تربیت کا کام ایسا ملا جلا کام ہے، طرح طرح کی قوتیں ہر طرف سے چل کر بچّے کی شخصیت میں اس طرح گڈمڈ ہوتی ہیں کہ انھیں الگ الگ کرنا دشوار ہے۔ مدرسہ جب اس کام کو اپنے سر لیتا ہے تو گھر بہت کچھ بنا یا بگاڑ چکتا ہے۔ پھر مدرسے کے سپرد ہونے کے بعد بھی گھر کا اثر

ختم نہیں ہو جاتا۔ یا تو گھر اور مدرسہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ایک دوسرے کے کام کو سمجھ کر ہاتھ بٹانے کا سامان کرتے ہیں یا وہ ایک طرف کھینچتا ہے یہ دوسری طرف، اِس کی ڈھولکی الگ اور اُس کا راگ جُدا۔

اب جو ننّھا مدرسے چلا تو دیکھنا یہ ہے کہ آپ یعنی ماں باپ اور سرپرست، اُسے پہلے سے کیا بنا چکے ہیں۔ مگر "آپ" تو نہ جانے کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے آپ ان کم نصیبوں میں ہوں جن کے پاس دوسروں کی کمائی ہوئی دولت اتنی ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کریں کیا۔ دولت کی فراوانی کا بوجھ بسا اوقات عقل کی کمی سے ہلکا ہوتا ہے، کیا عجب ہے کہ آپ کا بار بھی کچھ اسی طرح ہلکا ہوا ہو۔ اگر ایسا ہے تو گمان یہی ہے کہ آپ نے ننّھے کی تربیت کا فرض دولت کے صرف سے پورا کرنا چاہا ہوگا۔ ننّھے کے لیے بے شمار بے کار نوکر ہوں گے اور بے ضرورت سامان، طرح طرح کے کپڑوں سے بکس بھرے ہوں گے، لیکن شاید ہی کوئی لباس اس بچے کے لیے موزوں ہوگا، جوتوں کی قطاریں ہوں گی اور ننّھا اکثر ننگے پیر رہتا ہوگا، کھلونوں کا ایک عجائب خانہ ہوگا جن سے بچہ کبھی کا اُکتا چکا ہوگا، یہ نوکروں پر آپ کی تقلید میں جا اور بے جا حکومت جتاتا ہوگا، گھر میں لاڈ پیار کرنے والی دادی یا نانی ہوں گی تو اُن کی خوشنودی کے لیے گاہے گاہے آپ کو بھی کچھ سُنا دیتا ہوگا، اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کی نوبت مشکل ہی سے کبھی آتی ہوگی، کہ شانِ امارت کے خلاف ہے، بس کھانا

خود ہضم کرتا ہوتا ہوگا، تو شاید ہی کام ٹھیک انجام نہ پا سکتا ہوگا۔ بچہ چڑچڑا ہوگا، ضدی ہوگا، بدتمیز ہوگا، خودسر ہوگا، اور اب یہ مدرسے جانے لگا! آپ کے کسی دوست نے بتایا ہوگا کہ فلاں مدرسے میں بھیجو، وہاں فیس زیادہ ہے اس لیے مدرسہ ضرور اچھا ہوگا۔ آپ کو اگر فرصت ملی ہوگی، تو ایک خط بزبانِ انگریزی ہیڈ ماسٹر کے نام لکھ دیا ہوگا اور صاحبزادے دو تین نوکروں اور ایک دو اناؤں کے ساتھ آپ کی بڑی موٹر میں بیٹھ کر مدرسے تشریف لے گئے ہوں گے۔ اگر نانی اماں نے ایک ہفتے کے اندر اندر بچے کو مدرسے سے نہ اٹھا لیا تو یقین جانیے کہ مدرسہ آپ کے کیے کو اَن کیا کیے بغیر اپنا فرض مشکل ہی سے ادا کر سکے گا اور پھر بھی نہ معلوم کہ گھر کہاں کہاں مدرسے کی راہ میں آئے گا۔

ہو سکتا ہے کہ آپ ان قابلِ قدر خود ساختہ لوگوں میں ہوں جو اپنی محنت اور قابلیت سے آگے بڑھ کر اپنے پیشے یا کاروبار میں خاص امتیاز حاصل کرتے ہیں یا کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر پہنچ جاتے ہیں، آپ کو ضرور یہ فکر ہوگی کہ اپنے بچے کو اپنے سے بہتر تعلیم دیں۔ لیکن آپ کو خود اتنی کم فرصت ہوگی کہ اس کی دیکھ بھال کوئی دوسرا ہی کرتا ہوگا۔ لیکن جس طرح آپ اپنی مصروفیت کے باوجود زندگی کے سب اہم شعبوں، مذہب، معاشرت، سیاست پر قطعی اور فیصلہ کن رائیں رکھنا اور اُن کی اشاعت اپنے کم علم اور کم مایہ احباب میں کرنا ضروری جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے اپنی مشغول زندگی کے یک طرفہ

جھکاؤ میں کچھ بیہودہ پیدا کریں گے، اس طرح آپ اپنے بچے کی طرف توجہ نہ کر سکنے کی تلافی اس کے متعلق اور اس کی تعلیم کے امکانات کے متعلق قطعی، اور افسوس کہ فیصلہ کن، رائے قایم فرما کر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ چوں کہ کامیاب انسان ہیں، اس لیے اپنی نظر میں آپ ہی انسانیت کا معیار ہیں۔ اگر آپ کی نظر میں کہیں بچے کی یہ حیثیت زیادہ جمی کہ وہ آپ کی صلاحیتوں کا وارث ہے تو شاید آپ کی رائے ہوگی کہ آپ کا بچہ Genius ہے۔ اس کی سمجھ کے کیا کہنے، اس کے حافظے کا کیا پوچھنا! اُسے دو نظمیں زبانی یاد کرا دی گئی ہیں، جو آپ اکثر اس غریب سے اپنے احباب کے مجمع میں پڑھواتے ہیں، یہ انھیں خاص انداز سے سر ہلا ہلا کر اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر سناتا ہے، آپ نے خود فرطِ شفقت میں ایک اتوار کے دن اسے چند انگریزی جملے رٹا دیے ہیں، یہ آموختہ بھی اسے اکثر مجمعوں میں دُہرانا پڑتا ہے، اور ان مظاہروں کے بعد آپ اپنے احباب کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ لڑکا جینیس ہے جینیس، مگر آپ کو کون بتائے کہ اس معیارِ بلند سے تو سارے طوطے اور سارے بندر جینیس ہیں! اور اگر کہیں کثرتِ کار کی وجہ سے آپ کے اعصاب کچھ کمزور ہو گئے ہیں، جگر کا فعل بھی کچھ خراب ہے، اور بدقسمتی سے بچے سے کوئی خلافِ مزاج بات بھی چند بار ہو گئی ہے، کہ ایسی حالت میں خلافِ مزاج بات کرنے کے لیے کسی بڑے ہُنر کی ضرورت نہیں، تو آپ اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے

اس قطعی نتیجے پر بھی پہنچ سکتے ہیں کہ وہ گدھا ہے۔ اپنی دوسری رایوں کی طرح آپ اپنی اس رائے کا بھی وقت بے وقت اعلان فرماتے ہوں گے اور آدمی کے اس بچے کو گدھا بنانے میں اپنے بس بھر تو دریغ نہ فرماتے ہوں گے۔ اور اب آپ کا یہ "جینیس" یا آپ کا یہ "گدھا" اپنے غلط احساسِ برتری یا غلط تر احساسِ کمتری کے ساتھ مدرسے جاتا ہے! دیکھیے مدرسہ آپ کے پیدا کیے ہوئے اُلجھاؤ کو کس طرح سُلجھاتا ہے اور آپ کی مداخلت وہاں بھی کہیں اور گتھیاں تو نہیں ڈالتی۔ شاید آپ کی عدیم الفرصتی مدرسے کو اپنا کام کرنے دے اور آپ کا "جینیس" یا "گدھا" آدمی بن جائے!

لیکن ممکن ہے کہ نہ آپ بے حساب بے کمائی دولت کے وارث ہوں نہ دن رات کمائی کی کامیاب کشاکش میں مبتلا، بلکہ اوسط درجے کے معقول بھلے مانس ہوں، اپنی دوکان رکھتے ہوں، کسی دفتر میں سَو سوا سو کے ملازم ہوں، کسی مدرسے میں اُستاد ہوں، روز کچھ وقت اپنے بچوں میں بھی صرف کر سکتے ہوں، گھر کا کام آپ کی بیوی آپ سنبھالتی ہوں، نوکر چاکر نہ ہوں، سلیقے مند بیوی گھر کو صاف ستھرا رکھتی ہو، اور بچوں کی بھی دیکھ بھال کرتی ہو۔ آپ کا بچہ بہت سے اُن خطروں سے محفوظ ہے جن کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔ مگر پھر بچہ ہے، کبھی آپ کے صاف ستھرے گھر میں کہیں کچھ گرا دے گا، صاف چاندنی میلی ہو جائے گی، ماں جو روٹی ہنڈیا میں لگی ہے اُسے دیکھ کر خفا ہوگی اور کہے گی "اچھا آنے دے

ابا کو اپنے "کل ہی جو تجھے مدرسے نہ بھجوایا ہو تو"۔ کبھی بچے سے کوئی چیز ٹوٹ جائے گی، وہی مدرسے کی دھمکی، کبھی کھیل کود میں بچہ چلائے گا، شور مچائے گا۔ ابھی کپڑے بدلے گئے تھے، ابھی گرد میں اَٹا ماں کے سامنے آئے گا۔ وہی مدرسے بھیجنے کی دھمکی دی جائے گی۔ دھمکی کی تاثیر بڑھانے کے لیے مدرسے کی خاص بھیانک تصویر بھی کبھی کبھی بنائی جائے گی، اور یوں آج کے دن کے لیے کیا ہی خوب تیاری کی گئی ہوگی اس لیے کہ آج آپ کا ننھا بھی مدرسے چلا ہے۔

یا ہو سکتا ہے کہ آپ ہندوستان کے اُن کروڑوں کسانوں اور مزدوروں میں سے ہوں جن کے بچوں کے لیے بس گھر کا کٹھن زندگی ہی مدرسے کا کام دیتی ہے، جن کے لیے مدرسے قائم کرنے کو کبھی کافی پیسے فراہم نہیں ہو سکتے اور جن کے بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے اتنے مدرسوں کی ضرورت ہے کہ ہر "ماہر تعلیم" انگلیوں پر حساب لگا کر بتا دیتا ہے کہ اتنے مدرسے قایم کرنے کے لیے جس قدر سرمایہ درکار ہے وہ تو مہیا ہو ہی نہیں سکتا اور یہ بات بتا کر سمجھتے ہیں کہ بڑی دور کی کوڑی لائے۔ پھر ان سب دشواریوں کے ہوتے ہوئے بھی اگر کچھ مدرسے ان کے لیے بن جاتے ہیں تو یہ اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں بھیجنے کو تیار نہیں ہوتے۔ میں نے غلطی سے کہا کہ "آپ شاید ان کروڑوں کسانوں یا مزدوروں میں سے ہوں"۔ ان بے چاروں کو اتنی مہلت کہاں کہ بے فکروں کی طرح ریڈیو پر تقریریں سنیں۔ کہیں کہیں

تعلیم کے جبری ہو جانے کی وجہ سے، کہیں اس کے مفت ہونے کے لالچ سے، کہیں آس پاس کے خوش حال لوگوں کی دیکھا دیکھی، ایسے کسان یا مزدور کا ننھا بھی پڑھنے کے لیے بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہ ننھا جو گھر کے کاموں میں ماں باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے، جو بکریاں چرا لیتا ہے، کھیت پر باپ کے لیے روٹی لے جاتا ہے، ماں اُپلے تھوپتی ہے یا روٹی پکاتی ہے تو یہ چھوٹی بہن کو بہلا لیتا ہے، ہاتھ پاؤں کا خاصا مضبوط ہے، بس آنکھیں دُکھتی ہیں یا ناک بہتی ہے۔ لیکن آنکھ ملا کر بات کرتا ہے، بے سہارے زندہ رہ سکتا ہے، آدمی کا بچہ ہے، مُرمُروں کا تھیلا نہیں اور ہاں نہ "جینیس" ہے نہ "گدھا"، مگر اس کا باپ بھی چاہتا ہے کہ بچہ پڑھ کر پٹواری بن جائے، یہ نہ ہو سکے تو لال پگڑی والا چپراسی ہی سہی، جبریہ تعلیم کا قانون اس کے ضلعے کے چند گاؤں میں نافذ ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ بھی آج مدرسے جاتا ہے۔

اب آپ ہی دیکھیے کہ کیسے کیسے بھانت بھانت کے بچے مدرسے جاتے ہیں، گھر نے کیسے کیسے نمونے بنائے ہیں، کیا کیا امیدیں ہیں اور انھیں پورا کرنے کی کیسی کیسی تدبیریں! ماں باپ کے ذہنی اُلجھاؤ کو دیکھیے: اُن کے نتیجے یعنی بچوں کی ذہنی گتھیوں کا خیال کیجیے تب معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کا کام بھی کیسا مشکل ہے۔ لیکن کیا مدرسے والے اسے واقعی مشکل سمجھتے ہیں یا اُن کا دھیان اپنے کام کی اس دشواری کی طرف جاتا ہے؟ ان کی یہ مشکلیں تو سننے میں آئی ہیں کہ تنخواہ کم ہے،

کام بہت ہے، افسران کے سلام میں یا اس کی تدبیر میں فرصت کا اور کبھی کبھی کام کا بھی بہت وقت نکل جاتا ہے، چھٹیاں کم ہیں، افسر تعصب سے کام لیتے ہیں۔ بعض جگہ مہینوں تنخواہ نہیں ملتی۔ یہ سب اور ان جیسی بہت سی شکایتیں سننے میں آتی ہیں اور غالباً اکثر ٹھیک بھی ہوتی ہیں لیکن تعلیم اور تربیت کے کام کی اصل مشکل اور ہے۔ وہ مشکل وہی ہے جس کی وجہ سے گھر میں تربیت کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، یعنی بڑوں کا یہ زعم کہ وہی سب کچھ ہیں، بچہ کچھ نہیں؛ وہ سب کچھ جانتے ہیں، منزل جانتے ہیں، راہ پہچانتے ہیں، رفتارِ سفر کا تعین کر سکتے ہیں۔ کام اُن کی مرضی کے مطابق ہو، اور اُن کی مرضی کی رنگا رنگی کے کیا کہنے، تو سب ٹھیک ؛ اس کے خلاف ہو تو سب غلط۔ اُنھیں گھمنڈ ہے کہ بچہ اُن کی ملکیت ہے، وہ جو چاہیں اُسے بنا سکتے ہیں، چاہے اپنی دل لگی کے لیے اُسے اپنا کھلونا بنائیں، چاہے اپنے من مانے مقصدوں کے لیے اپنا غلام۔ اُنھیں اپنی بازی گری پر اتنا بھروسا ہے کہ آم کو املی اور املی کو آم بنا سکتے ہیں۔ پہلے بچہ گھر میں حقِ ملکیت اور ہمہ دانی کے اس جہلِ مرکّب سے دوچار ہوتا ہے، پھر مدرسے پہنچتا ہے۔ کیا مدرسہ اسے اس مصیبت سے نجات دلاتا ہے؟ کیا اُستاد صاحب بھی اس مرض میں مبتلا نہیں ہوتے جس میں سرپرست مبتلا تھے؟ کیا وہ بھی سب کچھ نہیں جانتے اور سب کچھ نہیں کر سکتے؟ کیا وہ بھی یہ نہیں سمجھتے کہ بچہ اُن کے ہنرمند ہاتھوں میں مٹی کا ایک انبار ہے، یہ جو شکل چاہیں اُسے دیں اور اُس کا ذہن ایک

سادہ صفحہ ہے یہ اُس پر جو چاہیں لکھ دیں ! یاروں نے تعلیم کے علمی نظریوں کی پوری عمارت اسی غلط بنیاد پر کھڑی کر دی ہے، اور تعلیم کا کاروبار بس اس نامبارک کوشش سے عبارت ہے کہ قدرت جو چاہتی ہے وہ نہ ہونے پائے یا جو ہم چاہتے ہیں قدرت کو بھی وہی چاہنا چاہیے۔ قدرت تو ہر بچے میں شخصیت کی تشکیل کے ان گنت امکانات میں سے کسی کی تکمیل چاہتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "ہر بچّہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اس بات کا اعلان ہے کہ خدا ابھی آدمی سے مایوس نہیں ہوا ہے" اور یہاں یہ اعتماد کہ جو سانچہ ہم نے تیار کیا ہے بس وہی آخری چیز ہے، شخصیت کے موم کو پگھلا کر بس اس میں ڈھالنا چاہیے اور جو ٹھپّا ہم نے بنایا ہے، وہی سب سے دُرست ہے، اسی کی چھاپ اس پر لگانا چاہیے۔

اس وقت کہ میں بچوں کے سرپرستوں اور اُن کے اُستادوں سے مخاطب ہوں یہ درخواست کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کسی طرح اپنے کو اس بنیادی خام خیالی سے نجات دلائیں، بچے کو آدمی کا پیش رو سمجھیں، اسے بے سہارے خود بھی بڑھنے دیں، اُس کی قدرتی صلاحیتوں اور میلانوں کا احترام کریں، سمجھیں کہ یہ ننھی سی جان اپنی نشو ونما کی امکانی تکمیل کی طرف خود قدم اٹھاتی ہے۔ اسے سہارا دیجیے، راستے سے کانٹے ہٹا دیجیے، مگر اس کے چلنے کی سمت تو نہ بدلیے۔ نہ اس پر اتنی توجہ دیجیے کہ وہ پھر اپنے پر خود توجہ ہی نہ کر سکے، نہ اتنی بے اعتنائی

برتیے کہ اُس کی وہ ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں جن میں وہ آپ کا واقعی محتاج ہے، نہ لاڈ پیار کی زیادتی سے اُسے مرنا؟ عویا بنایئے، نہ درشتی اور سختی سے زندگی سے یا کم سے کم آدمیوں سے بے زار۔ ذہنی زندگی کی بے شمار شکلوں کو دھیان میں رکھیے اور یہ یقین اپنے اوپر طاری نہ فرمایئے کہ اعلیٰ عہدے داروں یا کامیاب وکیلوں کے سب بچوں کو خدا خاص طور سے سول سروس کے امتحانوں میں بیٹھنے کے لیے بنا کر دنیا میں بھیجتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان ممکنات کی وجہ سے جو آپ کے "بچے" کی ذہنی زندگی میں ابھی چھپی ہوئی ہیں، ان قدروں کے پاس سے جن کا وہ حامل بن سکتا ہے، آپ اس کا ادب اور احترام فرمائیں۔ جی ہاں، آپ گھبرائیں نہیں، میں نے کہا کہ آپ "بچے" کا ادب اور احترام فرمائیں! بے بس "بچے" سے آزاد اخلاقی شخصیت تک پہنچنے کی کوشش واقعی واجب احترام کوشش ہے۔ آپ نے خود چاہے اس راہ پر قدم اٹھانا چھوڑ دیا ہو اور تھک کر کہیں بیچ ہی میں بیٹھ رہے ہوں کہ بے شمار آدمیوں کو اس منزل تک پہنچنے کا شرف حاصل نہیں ہو پاتا، لیکن آپ کا "بچہ" ابھی اس راہ پر پہلے پہل قدم اٹھا رہا ہے اس کا راستہ تو نہ روکیے اور یہ خطرہ بھی اپنے دل میں کبھی نہ گزرنے دیجیے کہ وہ آپ کی ملکیت ہے، آپ جو چاہیں اُسے بنائیں۔ وہ آپ کی ملکیت نہیں، آپ کے پاس قدرت کی امانت ہے، قدرت کے حق کو اپنے منصب سے اوپر جانیے۔

اُستادوں سے بھی جن کے مدرسے میں یہ بچے اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ سماج کے نزدیک گھر تعلیم و تربیت کے فرض کو پوری طرح انجام نہیں دے سکتا، میری یہی التجا ہے کہ آپ بھی اپنے شریف کام کا بنیادی اصول اسی ادب و احترام کو بنائیں۔ یہ اصول ذہن نشین ہوگیا تو تعلیم کے کام میں آپ کا سارا رویّہ بدل جائے گا، آپ اپنی جماعت کو بھیڑوں کا گلّہ نہ سمجھیں گے بلکہ اس میں ہر بچے کی مخصوص صلاحیتوں اور مخصوص ضرورتوں کا خیال رکھیں گے۔ میں نے آج کی گفتگو میں خاندانوں کی حالت کی وجہ سے بچوں میں جو فرق ہوجاتے ہیں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ اگر ان پر نظر نہ رکھیں گے تو جہاں سہارے کی ضرورت ہے وہاں دھکا لگ جائے گا، جہاں ہمت بڑھانے سے کام بن سکتا ہے وہاں آپ بے جانے دل شکنی کا سبب بن جائیں گے، جہاں آپ کے ایک تبسم سے بچے کے دل کی کلی کھِل سکتی تھی وہاں آپ کی بے رُخی سے اُس کے مُرجھا جانے کا اندیشہ پیدا ہوجائے گا، اگر بچے کا ادب اور احترام آپ کے نزدیک صحیح اصول ہوگا تو آپ اپنے شاگردوں کی ذہنی مشکلوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ہر ایک کے مناسب حال تدبیریں سوچیں گے۔ اس جماعتی فرقوں کے علاوہ بچوں کی ذہنی ضرورتوں میں جو فرق ہوتے ہیں اُن پر بھی آپ کی نظر رہے گی۔ شروع شروع میں جب یہ ذہنی فرق زیادہ صاف نہیں ہوتے تو آپ کوشش کریں گے کہ جو میلان زیادہ سے زیادہ بچوں میں ہو اُسی کو جماعت میں ذریعۂ تعلیم

بنائیں، مثلاً سات سے بارہ چودہ سال تک کے بچوں میں اگر آپ دیکھیں کہ بچے ہاتھ کے کام کی طرف مائل ہوتے ہیں تو آپ شاید اس بات پر اصرار نہ کریں کہ اُن کی تعلیم بس کتابوں ہی کی معرفت ہوا کرے کہ بزرگوں کے نزدیک کتابوں کا پڑھنا پڑھانا ہی تعلیم کہلاتا ہے۔ چھوٹے بڑے کا ادب محبت اور شفقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اصول جو میں نے بتایا ہے آپ میں بچے کی محبت اور اس پر شفقت کی صفت پیدا کر دے گا، آپ کو ناکامیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے برداشت اور صبر کی وہ قوت بخشے گا جو محبت کے بعد اُستاد کا سب سے بیش بہا سرمایہ ہے، آپ بچوں کے اچھے اُستاد یعنی قدرت کی امانت کے سچے امین بن جائیں گے اور آپ کے مشورے اور آپ کی مثال سے بچوں کے باپ اور سرپرست بھی اپنے فرض کو بہتر سمجھیں گے اور اُستاد اور سرپرست کے تعاون سے تعلیم و تربیت کا کام واقعی صحیح انداز پر کیا جا سکے گا۔

اچھا اُستاد

(یہ وہ تقریر ہے جو ۱۵ مئی ۱۹۳۶ء کو
آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی)

آدمی کی زندگی ہمیشہ کسی دوسری زندگی سے وابستہ ہوتی ہے، اس کی ذہنی زندگی کا چراغ ہمیشہ کسی دوسری ذہنی زندگی سے روشن ہوتا ہے۔ زندگی کی لہلہاتی باڑی میں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، اور یوں ہر انسان کسی دوسرے کا اُستاد، سکھانے والا بتانے والا اور بنانے والا ہوتا ہے۔ اُستاد کے معنی کو اتنا بڑھا دیں تو بات بہت پھیل جائے گی۔ ہم تو یہاں صرف اُن لوگوں سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو جان بوجھ کر سکھانے پڑھانے والے کا کام اختیار کرتے اور اُسے عملی طور پر انجام دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس کام کو اختیار کرتے ہیں اس لیے کہ ان کی طبیعت کا رجحان ادھر ہوتا ہے۔ طبیعت کا یہ میلان ایک قدرتی چیز ہے، خود بخود کسی طرف کو جھکی ہوتی ہے، اسی قسم کے کام کو جی چاہتا ہے اسی میں جی سکھ پاتا ہے۔ کچھ لوگوں کی

طبیعت کا جھکاؤ خود اپنی ذات کی طرف ہوتا ہے، اُن میں قوت کی آرزو، کمائی کا اپکا، جمع کر کرکے ڈھیری لگانے کی لت، لالچ، ہوس، اوروں سے منوانے کی چاہ ہوتی ہے۔ بعض طبیعتوں کا جھکاؤ اپنی طرف نہیں، اوروں کی طرف ہوتا ہے۔ اُن میں ہمدردی، ہمدمی، میل ملاپ، فیاضی دوسروں کو سہارا دینے اور مدد پہنچانے کی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔ کسی کو ہر چیز کا کھوج لگانے اور ہر بات کی تہہ کو پہنچنے کی دُھن ہوتی ہے۔ کوئی دنیا کو بنانے والے اور پالن ہار کے دھیان میں سرشار ہے، اپنے کو اس کے بڑے وجود میں ملا دینے، جدائی کو ختم کرکے وصل پیدا کرنے اور نجات حاصل کرنے کی لگن لگی ہے۔ کوئی چیزیں بناتا، بگاڑتا اور نئی نئی ایجادوں میں اپنے دل کو تسلّی دیتا ہے۔

آدمیوں کی اس بھیڑ میں معلّم کو کہاں ڈھونڈیں اور بھانت بھانت کی شخصیتوں میں اچھے استاد کو کہاں سے پکڑ نکالیں؟ اس سوال کے جواب میں اس بات سے مدد ملے گی کہ ہم یہ دیکھیں کہ جس کام کو آدمی کرنا چاہتا ہے، جن قدروں کا وہ حامل ہے، جن خوبیوں کا وہ جویا ہے یا بننا چاہتا ہے، وہ کس طرح پوری ہو سکتی ہیں؟ بعض خوبیاں صرف چیزوں میں آکر پوری ہوتی ہیں۔ بعض خوبیاں چیزوں اور آدمیوں دونوں میں اپنا کمال دکھاتی ہیں، مثلاً حسن کی خوبی چیزوں میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے، اور انسانوں میں بھی، صورت میں بھی اپنا جمال

دکھاتی ہے اور سیرت میں بھی۔ بعض خوبیاں ایسی ہوتی ہیں کہ صرف آدمیوں میں تکمیل کو پہنچ سکتی ہیں، جیسے اخلاقی اور مذہبی خوبیاں۔ اب جو شخص ایسی خوبیوں کا سیوک بنے جو صرف آدمیوں میں تکمیل کو پہنچ سکتی ہیں تو وہ خود بخود یا تو اپنی ذات پر دھیان دے گا یا اوروں کی طرف توجہ کرے گا۔ ان میں سے جس کا دھیان اپنے پر جم جائے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ دوسروں پر بھی دھیان دے۔ بے گنتی مذہبی لوگ ساری ساری عمر ایک اپنی ہی زندگی کے سنوارنے میں کھپا دیتے ہیں، ایک اپنی نجات کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور بعضے تو ترکٹی جاکر اپنی ناک کی چونچ کا مشاہدہ کرتے کرتے ساری عمر ختم کر دیتے ہیں۔ مگر جو کسی خوبی کو دوسرے آدمیوں تک پہنچانا چاہتا ہے اُسے اپنے سُدھار پر بھی کچھ نہ کچھ دھیان کرنا ہوتا ہے، جو کسی کو کچھ سکھانا چاہتا ہے اُسے خود بھی سیکھنا ہوتا ہے، جو کسی کو کچھ بنانا چاہتا ہے اُسے خود بھی کچھ بننا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی ذہنی بناوٹ میں دو باتیں، ہمدردی اور دوسروں سے میل ملاپ کی خواہش پہلے دن سے ودیعت ہوتی ہیں۔ یہ لوگ، یوں کہیے کہ، جماعتی اور سماجی آدمی ہوتے ہیں۔

اُستاد بھی اسی قسم کا سماجی آدمی ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر جماعتی آدمی اُستاد نہیں ہوتا مگر ہر اچھا اُستاد ضرور اسی سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ جماعتی آدمی ہونا، دوسرے آدمیوں کی زندگیوں میں ان خوبیوں کا خواہاں ہونا جن کا یہ آپ سیوک ہے، اوروں کو کچھ بنانے کا شوق اور

اس کے لیے خود کچھ بننے یا ہونے کی ضرورت، یہ اچھے استاد کے ذہن کی بناوٹ کا تانا بانا ہے۔ بازار میں اس سے ملتا جلتا نقلی مال بھی بہت ملتا ہے، مگر اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ ایسے اُستاد بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت دوسرے آدمیوں کی طرف ذرا نہیں جھکتی، انھیں کسی خاص خوبی سے بھی کوئی دِلی لگاؤ نہیں ہوتا۔ انھیں بس اپنا پیٹ پالنا ہوتا ہے دوسروں کو کچھ ہُنر سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ دُکان لگا دیتے ہیں، لوگ دام دیتے ہیں، یہ ہُنر بیچتے ہیں۔ غلّہ بیچ کر نہ کمایا، زراعت کی دو کتابیں لکھ کر کمالیا۔ اسی اُستاد کے روپ میں اور لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اکثر اُستادوں کے بھیس میں ایسے کاری گر ہوتے ہیں جن کی ساری عمر کی کوشش سے کچھ جھوٹے ریاکار، جو دیکھنے میں تو بہت اچھے مذہبی اور اخلاقی لوگ ہیں، پیدا ہوتے ہیں، مگر ان کے نیک عمل کی جڑیں اُن کے دل تک نہیں پہنچتیں۔ یہ لوگ جھوٹے مال پر اپنے کارخانے کا ٹھپّا لگا دینا کافی سمجھتے ہیں اور اصل دھات کو بدلنے کی جگہ ملمّع کر دینے پر راضی رہتے ہیں۔

سچے اُستاد کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ دوسرے آدمیوں سے محبّت رکھتا ہو، اس کے دل میں آدمیوں سے بحیثیت آدمی پیار ہو۔ آپ ان سچے "معلموں"، اچھے استادوں پر نظر ڈالیے تو ان میں بہت سے گہرے مذہبی لوگ نظر آئیں گے، حسن و جمال کے دل دادہ آرٹسٹ بھی ان کی صف میں ملیں گے، لیکن یہ صفتیں ان کی ذہنی بناوٹ میں

بیل بوٹے ہیں، تانا بانا وہی، خدمت کا شوق اور بنی نوعِ کی محبت ہے۔

اُستاد کی کتابِ زندگی کے سرِ ورق پر "علم" نہیں لکھا ہوتا "محبت" کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے، ان سے محبت ہوتی ہے، ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں۔ ان میں جہاں تک اور جس اسلوب سے ان خوبیوں کی تکمیل کا سامان ہے، یہ اس میں مدد دیتا ہے، اسی کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔

اچھے اُستاد کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کی طبیعت کا میلان آپ ہی آپ بچوں اور نوجوانوں کی بنتی ہوئی شخصیتوں کی طرف ہوتا ہے۔ ان ہی میں رہ کر اسے راحت ملتی ہے، ان کے بغیر دنیا میں پردیسی کی طرح بھٹکتا ہے۔ یہ بس مدرسے کی جماعت ہی میں اُستاد نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت اس کا دل اپنے شاگردوں ہی میں اٹکا ہوتا ہے۔ استاد کی اس محبت کی تشریح بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے اس میں اور بہت سے سادہ جذبات کی آمیزش ہوتی ہو، ممکن ہے اپنے کو منوانے کی خواہش بھی اس کے دل میں کام کرتی ہو، ممکن ہے بچوں کا دل ہاتھ میں لینے، اپنے لیے ان کی محبت اور اطاعت حاصل کرنے کی آرزو بھی اس میں ملی ہوتی ہو، یعنی تھوڑی سی خودغرضی

بھی۔ ہاں کیوں نہیں، ضرور یہ بھی ہوتا ہو گا اور اگر میل زیادہ ہو جائے تو اصلی جوہر کی خوبیاں ممکن ہے کہ دب جائیں، مگر غور سے دیکھیے تو اچھے اُستاد کے سارے کام میں ایسے مول تول اور حساب کتاب کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ اچھا استاد اپنے بہت سے کاموں کو بچوں ہی کی طرح قدرتی طور پر زیادہ سوچے بغیر ہی کر گزرتا ہے۔ جو کام اپنا مقصد آپ ہوتے ہیں اور اپنے سے باہر کوئی غرض نہیں رکھتے انھیں کھیل کہتے ہیں۔ ہاں تو استاد کا کام بہت کچھ تو کھیل ہی کھیل میں انجام پا جاتا ہے۔ اس کا کام اکثر اپنا انعام آپ ہوتا ہے۔ دنیا داروں، ناپ تول کرنے والوں کی نظر میں یہ حماقت ہو تو بے شک اچھا اُستاد اس حماقت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یورپ کے ایک مشہور استاد پستالوزی نے ایک جگہ اپنا اور ایک حسابی کتابی دنیا دار کا مکالمہ خوب لکھا ہے۔ پستالوزی نے کہا "میں تو اپنی زندگی میں ہمیشہ کچھ بچہ ہی سا رہا۔ شاید یہی بات تھی کہ لوگ ہزاروں رنگ سے مجھ سے کھیلتے رہے"۔ عقلمند دنیا دار بولا "اگر آپ کا حال یہ ہے تو اچھا ہو کہ آپ کسی کونے میں جا کر بیٹھ رہیں، اپنی حماقتوں پر شرمائیں اور بس چپ رہیں"۔ جواب ملا۔ "جی ہاں، شاید آپ کا خیال درست ہو"۔ دنیا دار بھلا کب چپ ہونے والا تھا، بولا "تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟" پستالوزی نے کہا "جی ہاں، ایسا بھی کر چکا ہوں۔ لیکن کیا کروں، اب بھی کچھ ایسے آدمی پڑے ہیں جن سے لوگ اسی طرح کھیلتے ہیں جیسے مجھ سے کھیلتے تھے۔

کبھی کبھی ان سے کچھ کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔" دنیادار بزرگ اِس سادگی کی تاب نہ لاسکے اور بے تکلف ہو کے بولے "یار، تم تو اب تک بس ننھے بچے ہی ہو۔" تو پستالوزی کیا اچھا جواب دیتا ہے، جس میں اچھے معلّم کی روح جھلکتی ہے "جی ہاں، بچّہ ہی ہوں اور مرتے دم تک بچّہ رہنا چاہتا ہوں۔ تمھیں کیا بتاؤں، دل کو اس میں کیسی راحت ملتی ہے کہ آدمی زرا زرا بچّہ بھی ہو، یقین کر سکے، بھروسا کر سکے، محبّت کر سکے، غلطی ہو جائے، بھول چوک ہو، حماقت ہو تو ان سے لوٹ آسکے اور آپ کے سارے عقل مند لفنگوں سے زیادہ بھولا، زیادہ اچھا اور آخر میں چل کر زیادہ عقل مند بھی نکلے۔ جناب عالی، اس کے خلاف بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سنا، مگر پھر بھی اس میں بڑا مزا ہے کہ آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے، روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے اور عقل مندوں کو اور بے وقوفوں کو کہ دونوں گُم راہ ہوتے ہیں، معاف کرے۔"

یہ قول ایک اچھے استاد ہی کا ہو سکتا تھا۔ عقل مند لوگ اسے حماقت جانیں تو اچھا حماقت ہی سہی، اور اسے بچپن بتائیں تو یہ بے شک بچپن ہے اور جب تک اُستاد میں یہ بچپن ہے وہ بچّوں کے دل کے راز جانتا ہے اور ان کی زندگی میں برابر کا شریک ہو کر ان کو بلندی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ جس استاد میں یہ بچپن نہیں ہوتا وہ بچّوں کے دل کی بولی نہیں سمجھتا، نہ انھیں اپنی سمجھا سکتا ہے۔ نادانی سے

جدھر قدم اٹھاتا ہے تو کچھ نہ کچھ کچل ڈالتا ہے، کچھ نہ کچھ توڑ ڈالتا ہے۔ جس استاد میں علمی تحقیق کا انہماک یا غور و خوض کی زیادتی ہو وہ اس کے بچپن کو کم کر دیتے ہیں، وہ پہلے سے بہتر عالم ہو جاتا ہو یا وہ چیز جسے "ماہرِ تعلیم" کہتے ہیں، پر اُستاد وہ پہلے سے بُرا ہوتا ہے۔

ہاں، میں نے استاد کی جو یہ پہلی پہچان بتائی کہ اسے بچوں اور نوجوانوں سے قدرتی لگاؤ اور اُنس ہو اور وہ بچوں میں بچہ بن سکے تو یہ ہے تو پہلی اور ضروری چیز مگر صرف یہی کافی نہیں۔ ہر اچھے استاد میں اس کا ہونا ضروری ہے، پر ہر وہ شخص جس میں یہ ہو اچھا استاد نہیں ہوتا۔ محبت کے اس میلان کو ایک خاص طریقے سے کام میں لانے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔ یہ صلاحیت مشق اور محنت سے بڑھ سکتی ہے مگر ہوتی یہ بھی قدرتی ہے اور خداداد۔ اسے بہتیرے علوم سے مدد بھی ملتی ہے، تعلیمات اور نفسیات کے اصول جاننے سے بھی کام نکلتا ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اچھے استاد میں بچوں کی شخصیت کو سمجھنے کی قدرتی صلاحیت ہونی چاہیے۔ جب کوئی کسی بڑھتی ہوئی، بدلتی ہوئی زندہ چیز پر اثر ڈالنا چاہے جیسا کہ اُستاد چاہتا ہے، تو اس چیز کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ اچھے اُستاد میں وہ صفت ہونی چاہیے جو اچھے ڈراما لکھنے والے، اچھے ناول نگار، اچھے مورخ میں ہوتی ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے واقعے سے، ایک ذرا سی بات سے، ایک معمولی سی حرکت سے، چہرے کے رنگ سے، آنکھوں سے، تیور سے، غرض

اظہار کے معمولی سے طریقے سے پورے آدمی کی کیفیت کا پتا لگا لیتے ہیں۔ نفسیات کے عام قاعدے یہاں آکر دھوکا دیتے ہیں اور حجاب بن جاتے ہیں۔ کوئی قدرتی وجدانی قوت ہوتی ہے جو ان ننھے ننھے دریچوں سے جھانک کر روح کی چھپی ہوئی کیفیتوں کو دیکھ لیتی اور سمجھ لیتی ہے۔ اچھے اُستاد کی دوسری پہچان یہ ہے کہ اس میں یہ وجدان ہو اور اچھا اس کی یہ تیزی ہو۔

مگر سمجھ لینا اور جان لینا بھی تو کافی نہیں۔ سمجھ کر، جان کر، صحیح طور سے اثر ڈالنے کی صلاحیت بھی تو ہونی چاہیے۔ تشخیص کے بغیر علاج نہیں ہوتا، لیکن کسی کو خالی تشخیص آتی ہو اور علاج نہ آتا ہو تو وہ بھی تو شفا نہیں بخش سکتا۔ استاد کی طبیعت بہت حاضر ہونی چاہیے کہ معاملے کو سمجھتے ہی تقریباً بلا غور کیے صحیح تدبیر اس کی سمجھ میں آجائے۔ کتابیں پڑھ کر بچوں پر اثر ڈالنے والے غور ہی کرتے رہتے ہیں اور معاملے اور اس کی تدبیر کے بے شمار کتابی امکانات کے گورکھ دھندے میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں اور اچھا استاد اپنے فطری ٹیکٹ (Tact) سے صحیح تدبیر کر گزرتا ہے۔ کبھی ہنس کر، کبھی خفا ہو کر، کبھی تعریف کر کے، کبھی نرم سی ملامت سے، کبھی اُکسا کر، کبھی ذرا روک کر، کبھی اپنی طرف کھینچ کر، کبھی اپنے سے دور کر کے، کبھی نکتہ چینی سے اور کبھی چشم پوشی سے یہ اپنا کام کر لیتا ہے۔ ان سب موقعوں کے لیے کتابوں میں ہدایتیں درج ہوں گی اس لیے کہ کتابوں میں تو اب سب کچھ درج ہے۔

پر جس وقت کام پڑتا ہے تو "لال کتاب" کے دیکھنے کا موقع نہیں ہوتا اور اگر اس کی کوئی عام ہدایت یاد بھی ہو تو اس عام قاعدے کو اس خاص معاملے پر لگانا بھی جب ہی ممکن ہوتا ہے جب کہ اُستاد میں "قدرتی ٹیکٹ" موجود ہو۔

مصلحوں اور پیغمبروں کی طرح استاد کو بنی بنائی شخصیتوں سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ ان سے سروکار ہوتا ہے جو ابھی بن رہی ہیں۔ مصلح اور پیغمبر تو بنی ہوئی شخصیتوں سے اپنا کام لے بیٹھتے ہیں، انھیں ان عقیدوں، رسموں، اداروں اور خیالوں کا خادم بنا دیتے ہیں جن کے پھیلانے یا قایم کرنے کے لیے یہ آئے ہیں۔ جو انھیں قتل کرنے نکلتے ہیں ان کی زندگی کا رُخ بدل کر انھیں مخالفوں کے واسطے قہر بنا دیتے ہیں۔ جو پہلے ایک طرف جھکتا تھا اس کا سر اب دوسرے کے سامنے جھکا دیتے ہیں۔ استاد کو سابقہ پڑتا ہے بے بنی شخصیتوں سے، اُسے اپنے شاگرد کی بننے والی شخصیت کا رخ سمجھنا اور اس کے امکاناتِ ترقی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور اسے درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد کرنی ہوتی ہے۔ نہ خالی عقل کی نگاہ سے یہ امکانات دکھائی دیتے ہیں، کہ آدمی کی زندگی میں نہ جانے کتنے غیر عقلی حصّے ملے ہیں، نہ خالی وجدان اور طبیعت کی ذکاوت پر استاد بھروسا کر سکتا ہے۔ یہاں عقل اور وجدان کو ملانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھا استاد ان مختلف سانچوں سے آشنا ہوتا ہے، جن میں آدمی کی سیرت عموماً ڈھلتی ہے اور ان

عام معلومات کے ساتھ بچے کی خاص حالت کا مشاہدہ اسے صحیح نتیجے تک پہنچا سکتا ہے۔ چنان چہ پہلے بیان کی ہوئی صفتوں کے ساتھ اچھے استاد میں صحیح مشاہدے کی صفت بھی ہونی چاہیے کہ اس کے بغیر وہ اپنے شاگرد کی پوری شخصیت کی تشخیص نہیں کر سکتا، اس کے بغیر اس کی پوری ترقی میں مدد نہیں دے سکتا۔ اس مشاہدے میں اکثر خود استاد کی بنی بنائی شخصیت روک بن جاتی ہے۔ آدمی مُردہ چیزوں کا مشاہدہ تو کچھ بے تکلفی سے کر سکتا ہے، پر انسان کے تو جسم کا مشاہدہ تک بے تکلفی سے کرنا دشوار ہے۔ دل اور روح کا مشاہدہ تو کیسے بے تعلقی سے ہو سکتا ہے؟ اس کے لیے خود اپنے سے لڑنا اور اپنے کو دبانا ہوتا ہے۔ محنتی اور بدشوق، سیدھے اور شریر، مطیع اور گستاخ، تیز اور سست، ہنس مکھ اور رونی صورت سب کو ایک نظر سے بے تعلقی کے ساتھ دیکھنا سہل کام نہیں۔ مگر اچھے استاد کا کام بھی سہل نہیں ہوتا اور یہ شرف ہر ایک کو تو حاصل بھی نہیں ہو سکتا۔

استاد کا اصلی کام سیرت کی تیاری ہے اور ساری تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ بچے کے ارادے اور عمل کی قوت کو کسی سیدھی راہ پر ڈال دے اور سچے اصولوں کی روشنی میں، اچھی عادتوں کی مدد سے، اس کی سیرت میں یک سوئی اور پختگی پیدا کر دے۔ جو شخص استاد بن کر تعلیم کا یہ کام انجام دے اسے خود بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سیرت کو کس راہ پر ڈالے، خود اس کی سیرت کا بھی تو کوئی رنگ، خود اس کی

زندگی کا بھی تو کوئی مستقل ڈھنگ ہونا چاہیے۔ اس کے اثر سے بچے میں یکسوئی تو تب ہی پیدا ہوگی کہ خود اس میں یکسوئی ہو۔ جو خود تھالی کے بینگن کی طرح اِدھر اُدھر لُڑھکتا ہو وہ دوسروں کو ایک سمت میں کیسے چلا سکے گا؟ یکسو سیرت کے مختلف اجزا پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، اتنا کہنا بس ہے کہ اچھی سیرت اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کے ارادے میں کچھ مضبوطی ہو، جس کی رائے میں صحت ہو، جو صحیح حکم لگا سکے اور ٹھیک تمیز کر سکے، جس کے جذبات میں لطافت ہو اور جو دوسرے کے حال کو اس لطافت کی وجہ سے آسانی کے ساتھ سمجھ سکے۔ پھر جس میں ان خوبیوں کے لیے جنھیں وہ خوبیاں جانتا ہے، جوش اور ولولہ ہو۔ اور تین صفتوں کا ذکر تو پہلے کسی نہ کسی سلسلے میں ہو چکا ہے، یہ آخری جوش اور ولولے کی صفت بھی یاد رہے کہ استاد کے لیے بہت ضروری ہے۔ اچھے استاد کی جذباتی زندگی میں وسعت بھی ہوتی ہے، گہرائی بھی اور پائیداری بھی۔ اس کی روح میں حق و صداقت، حسن و جمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہر سے ایک گرمی پیدا ہوتی ہے، جس سے وہ دوسرے دلوں کو گرماتا ہے اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو کھرا بناتا ہے۔

اس جگہ ایک بات صاف کر دینا اچھا ہے۔ استاد اپنے شاگردوں کی سیرت کو اپنے اثر سے جو رنگ دیتا ہے اس میں شاید کسی کو حکم رانی اور قوت اور جبر کا شائبہ نظر آئے، کہ حکم راں بھی دوسروں کے ارادوں کو

اپنا تابع بناتے ہیں اور استاد بھی دوسروں کی زندگی کو اپنے نقش پر چلانے کی تدبیر کرتا ہے اور دوسروں سے اپنے ارادے پورے کراتا ہے۔ لیکن یہ دھوکا ہے۔ بات یوں نہیں۔ اچھے استاد میں اہلِ قوت اور حکم رانوں کی سیرت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حکم راں جبر کرتے ہیں، یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کرکے ایک راہ پر چلاتے ہیں یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے، ایک کے وسائل ہیں تشدّد اور زبردستی دوسرے کے محبّت اور خدمت، ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے دوسرے کا شوق سے، ایک حکم دیتا ہے دوسرا مشورہ، وہ غلام بناتا ہے اور یہ ساتھی۔

ان خوبیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی صفتیں اچھے استاد میں پائی جاتی ہیں۔ اچھا مدرس ہونے کے لیے یہ اچھا مقرر بھی ہوتا ہے اور ایسی ہی بہت سی چھوٹی چھوٹی خوبیاں اور رکھتا ہے مگر اس کا امتیاز یہی ہے کہ اس کی زندگی کی جڑیں محبّت کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہیں، اس لیے یہ وہاں امید رکھتا ہے جہاں دوسرے دل چھوڑ دیتے ہیں، وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں، اسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ زندگی کی پستیوں کو بھی دیکھتا ہے، لیکن ان کی وجہ سے اس کی بلندیوں کو بھول نہیں جاتا، اور بڑے کی قدر کے ساتھ ساتھ چھوٹے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ فوق البشر کا تصوّر بھی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے مگر نادان اور بے بس

بچے کی خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے اور بچے کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے ـــــ ایک اس کی ماں اور دوسرا اچھا استاد!

ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم

(یہ وہ خطبۂ صدارت ہے جو ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء کو نیو ایجوکیشن فیلوشپ پنجاب، کے اجلاس منعقدہ سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور، میں پڑھا گیا)

بھائیو اور بہنو!

سب سے پہلے، آپ کا شکریہ ادا کرنے سے بھی پہلے، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ عام دستور کے خلاف آپ کی خدمت میں یہ خطبہ اپنی مادری زبان میں پیش کر رہا ہوں۔ عجیب سی بات ہے کہ ایسا کرنے پر معافی مانگ رہا ہوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر کسی دوسری زبان میں آپ کو مخاطب کرتا تو عذر خواہ ہوتا۔ لیکن ہماری مجلسوں کے عام دستور نے صورتِ حال کو بالکل اُلٹا کر دیا ہے۔ انگریزی، ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بن گئی ہے۔ وہ اس میں پڑھتے ہیں، اس میں لکھتے ہیں اور اگر کبھی سوچتے ہوں تو شاید اسی میں سوچتے ہیں۔ جب اہلِ علم کی کسی مجلس میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو اپنے افکار کو انگریزی الفاظ ہی کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا اس سے مجھے اس وقت بحث نہیں۔

اچھا ہوا یا بُرا ہوا، اس پر بھی کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں تعلیم کسی ایک چھوٹی سی ذات کے ساتھ مخصوص رہنے والی نہیں ہے، اگر اس ملک کے بسنے والے جانوروں کے گلّوں کی طرح نہیں بلکہ آدمیوں کی جمعیتوں کی طرح زندگی گزارنے پر مصر ہیں، اگر یہاں کی حکومت کسی چھوٹے سے طاقت ور یا چالاک گروہ کا اجارہ نہیں بلکہ یہاں کے جمہور کی مرضی کے مطابق ہونے والی ہے، تو علمی زبان کے معاملے میں صورتِ حال بدلے گی اور جلد بدلے گی۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں انگریزی زبان کی قدر کرنا نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں کہ ہم نے انگریزی زبان کی معرفت بہت کچھ سیکھا ہے، جانتا ہوں کہ بہت کچھ اس سے اور سیکھنا ہے۔ اس نے ہمارے خیالات کے جمود میں حرکت پیدا کی۔ اس نے ہمیں مغرب کے علوم و فنون، صنعت و حرفت، تمدّن و افکار سے آشنا کیا۔ اس نے سیاست اور معیشت کے نئے اسلوبوں سے ہمیں آگاہ کیا۔ اس کا ہم پر بڑا احسان ہے اور اس سے ابھی اور بہت کام لینا ہے کہ ہم میں اور مغربی تمدّن میں یہی ایک واسطہ شاید عرصے تک قایم رہنے والا ہے۔ لیکن جہاں میں یہ سب جانتا ہوں وہاں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم انگریزی جاننے والوں نے جو ایک نئی ذات اس ملک میں بنائی ہے، اس نے غیر شعوری خود غرضی سے ہر ذات کی طرح اپنے مخصوص فوائد کو اپنے تک محدود رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنے علم کو تفوّق کا ذریعہ بنایا ہے۔ جو سیکھا وہ سکھایا نہیں۔

خواص کو جو حاصل ہوا عوام تک نہیں پہنچایا گیا۔ اپنے کو سیراب کیا ہے اور قوم کو پیاسا رکھا ہے اور چوں کہ علم و حکمت کے خزانے بچانے سے گھٹتے ہیں اور لٹانے سے بڑھتے ہیں، اس لیے اس طبقے کی خودغرضی نے اسے بھی کچھ کم نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی قوم کی حقیقی زندگی سے بے تعلقی نے انھیں اپنے دیس میں پردیسی بنا دیا، وطن میں جلاوطن کر دیا، ان کے افکار میں جودت پیدا نہیں ہونے دی، ان کے کردار کو خلوص سے بہرہ یاب نہیں ہونے دیا، ان کی زبان کو مانگے کی گفتگوئیں ملیں اور ان کے دلوں کو مانگے کی آرزوئیں۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

بر زبانش گفتگوہا مستعار
در دلِ او آرزوہا مستعار

خیر یہ جو ہوا سو ہوا۔ ہمیں اب جلد سے جلد اسے بدلنا چاہیے۔ خصوصاً تعلیم کا کام کرنے والوں کو اس میں ذرا دیر نہ کرنی چاہیے کہ اپنی راہ سے ایک پردیسی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کی مصیبت کو ہٹائیں۔ اور ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لیے جو کانفرنس یہاں جمع ہے اس کے اراکین کو تو جاننا چاہیے کہ ان کا سارا کام بچوں میں اور بچوں کے والدین کے ساتھ مادری زبان ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس لیے اپنی زبان میں یہ خطبہ دینے پر معافی مانگنا کچھ بہت ضروری تو نہیں ہے لیکن رسم و رواج

کے مطالبے سخت ہوتے ہیں۔ ہماری علمی مجلسوں میں مادری زبان کو راہ ملنا نئی بات ہے۔ میں آپ سے اجازت لیے بغیر اسے یہاں لے آیا ہوں۔ اس لیے معافی چاہتا ہوں، اگرچہ اس عذرخواہی میں تھوڑا سا گلہ اور تھوڑی سی تنبیہ ضرور شامل ہے۔

آپ نے معاف کر دیا ہو اور یقین کرتا ہوں کہ معاف کر ہی دیں گے، تو اب آگے چلوں۔ سب سے پہلے آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس مجلس کی صدارت کے لیے آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے کام سے ایک عرصے سے واقف ہوں اور اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اس فیلوشپ نے دنیا کے مختلف ممالک میں تعلیم کا کام کرنے والوں کو نئی راہیں سجھائی ہیں۔ اس نے بچوں کی انفرادیت کو سانچوں اور ٹھپّوں میں دبانے سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ بچوں کی صلاحیتوں اور میلانوں کو ان کی تعلیم کی بنیاد بنانے پر زور دیا ہے۔ بچوں کے ذاتی شوق کے کاموں کی مدرسے اور گھر میں ہمت افزائی کی ہے۔ آزادی میں ڈسپلن کے صحیح تصوّر کو عام کیا ہے۔ تعلیم میں کھیل اور اجتماعی کام کی اہمیت کو جتایا ہے اور سب سے اہم یہ کہ تعلیم کا کام کرنے والے استادوں کو ایک نئی امید بخشی ہے اور ان میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا ہے۔ اور ایک بے روح سے انفرادی بیگار کو ایک پُرکیف جماعتی وظیفے کا مرتبہ دلایا ہے۔ اس فیلوشپ کی کسی کانفرنس میں صدارت کا شرف میرے استحقاق سے بہت زیادہ

ہے۔ لیکن آپ کی محبت نے مجھے یہ شرف بخش دیا، دل سے شکرگزار ہوں۔

آپ اس مجلس میں ابتدائی تعلیم اور اس سے پہلے کی تعلیم دونوں کے متعلق غور و بحث کرنے والے ہیں۔ میں نے ابتدائی تعلیم کے مسائل پر سوچنے اور کام کرنے میں کچھ وقت ضرور صرف کیا ہے لیکن اس سے پہلے کی تعلیم کے متعلق اب تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ اس لیے ذاتی تجربے سے اس پر کچھ عرض نہیں کر سکوں گا۔ البتہ لازمی بنیادی تعلیم کی حمایت کی وجہ سے بعض احباب نے مجھ پر جو یہ شبہہ کیا ہے کہ میں اس سے پہلے کی تعلیم و تربیت کو شاید کچھ اہمیت نہیں دیتا اور اس کے مسائل کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتا وہ درست نہیں ہے۔ انفرادی عملی زندگی میں ایک وقت میں ایک چیز کا اصول اکثر کارآمد ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے معنی دوسری سب چیزوں سے غفلت یا بے تعلقی نہیں ہوتے۔ بنیادی تعلیم کی ضرورت پر، اسے مفت اور لازمی بنانے پر، پچھلے چند سال میں بجا طور پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس بنیادی تعلیم کی منزل سے پہلے کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں اب تک اس ابتدائی عمر میں تربیت کے مسئلے کو زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا ہے حالاں کہ زندگی کی بعض بنیادی عادتوں کے بننے بگڑنے میں یہ زمانہ بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ چاہے جسمانی نشو و نما کو دیکھیے کہ عمر کے پہلے ہی سال

میں بچے کا قد پیدائش کے وقت سے کوئی تگنا ہوجاتا ہے اور پھر ساری عمر کبھی اس تیز نسبت سے نہیں بڑھتا۔ پہلے ۱۸ مہینے میں دماغ کے وزن میں جتنا اضافہ ہوتا ہے پھر کبھی اتنی مدت میں اتنا نہیں ہوتا۔ نظامِ اعصابی اور حسّی اعضا کا بھی یہی حال ہے۔ بدن کی اس تیز بڑھائی کی وجہ سے ہی یہ زمانہ تن درستی کے لیے خطروں سے پُر زمانہ ہے۔ ہمارے مُلک کا تو کہنا ہی کیا یہاں کی فضا میں جو ہزار بچے پہلا سانس لیتے ہیں اُن میں سے پونے دو سو کے قریب تو طفلی کی منزل سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ دوسرے ممالک میں بھی جہاں زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے اور بچے زندگی کے دسترخوان پر ناخواندہ مہمان کی حیثیت نہیں رکھتے، وہاں بھی یہ خطرے ننھی ننھی جانوں کو انگیز نے پڑتے ہیں۔ امریکا میں بھی ساری اموات کا ایک تہائی ۵ سال سے کم عمر والوں کے حصّے میں آتا ہے۔ انگلستان میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۸۰ سے ۹۰ فی صدی بچے تن درست پیدا ہوتے ہیں، مگر جب ۵ سال کی عمر میں مدرسے جاتے ہیں اور وہاں طبّی معائنہ ہوتا ہے تو ایک تہائی سے زیادہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں، کہیں غذا کی وجہ سے چاہے کمی سے چاہے زیادتی سے، کہیں متعدّی امراض کے نتیجے کے طور پر، کہیں گھر کے مضرِ صحت طبیعی ماحول کی بدولت، کہیں گھر کی نفسیاتی اُلجھنوں کی کھینچ تان کے اثر سے، اور جہاں ان حالات کو بدلا گیا ہے وہاں یہ صورت بھی بدل جاتی ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ

اچھی تربیت گاہوں میں جا کر بچوں کی صحتیں درست ہو جاتی ہیں، بیماریاں بھاگ جاتی ہیں، دانتوں کی حالت اور ہو جاتی ہے اور بچوں کے مقابلے میں قد اور وزن تیزی سے بڑھتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ یہ زمانہ بچے کی جسمانی نشوونما ہی کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہو، سیکھنے کی رفتار بھی جسمانی بڑھاؤ کی رفتار سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ اسی زمانے میں بچہ حواس کا استعمال سیکھتا ہے۔ ان کی مدد سے اپنے ماحول کی پہچان حاصل کرتا ہے؛ جسم کے پٹھوں پر قابو حاصل کرتا ہے، حسی اور حرکتی تجربے میں تطابق پیدا کرتا ہے، چلنا سیکھتا ہے، بولنا سیکھتا ہے۔ ڈھائی تین سال کی عمر میں اپنی مادری زبان کو کام چلانے کے لائق سیکھ چکتا ہے۔ چیزوں کے روابط باہمی کا ادراک اسے ہونے لگتا ہے۔ تفصیل کی راہ پر اسی عمر میں گام زنی شروع کر چکتا ہے اور تجربے کے جذباتی پہلو میں تو اس کے نشوونما کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے کہ جاننے والے کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں اس کی سیرت کی بنیادیں پڑ چکتی ہیں۔ زندگی کا اور کون سا زمانہ اتنی اور ایسی بنیادی اہمیت رکھنے والی تفصیلات سے پُر ہوگا؟

نہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہماری قومی زندگی کی تشکیل اور تنظیم کے ذمے دار واقعی اپنے فرض سے عہدہ برا ہونا چاہتے ہیں تو انھیں اس عمر کے بچوں کی تربیت کو پہلے سے زیادہ اپنے منصوبوں میں جگہ دینی ہوگی۔ میں نہیں جانتا کہ بنیادی تعلیم ۷ سال کی عمر سے

لازمی کی جائے گی جیسا کہ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کی تجویز ہے یا ۷ سال کی عمر سے جیسا کہ بنیادی قومی تعلیم کی تجویز کا مطالبہ ہے۔ بہرحال ۲ سے دیا جو عمر آپ کی کانفرنس غور و بحث کے بعد طے کرے) ۶ یا ۷ سال کی عمر کے بچّوں کی دیکھ بھال، طبّی جانچ اور مناسب علاج، ان کے لیے کھلی ہوا میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ دن کا ایک معتدبہ حصّہ گزارنے کا انتظام، اس عمر کی ضرورتوں اور تقاضوں کو جاننے والوں کی مشفقانہ نگرانی میں صحت اور صفائی کی، میل جول کی زندگی کی، اپنے ننھے ننھے پیروں پر کھڑے ہو سکنے کی، دوسرے ننھے اور نازک ساتھیوں کو سہارا دینے کی، انفرادی اور اجتماعی عادتیں پیدا کرنے کا اہتمام ضرور کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں اس عمر کے بچّوں کو بالک باڑیوں اور ننھّوں کی تربیت گاہوں میں بھیجنا ابھی والدین پر لازم تو نہیں کرنا چاہیے، لیکن بچّوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے، خصوصاً جہاں گھر معاشی یا دوسری مجبوریوں کی وجہ سے اپنا فرض انجام نہیں دے سکتا، ان تربیت گاہوں کا انتظام حکومت کی طرف سے ضرور ہونا چاہیے۔ غیر سرکاری انتظام میں ایسی تربیت گاہیں کھولی جائیں تو فیاضی سے ان کی مدد حکومت کا فرض ہے۔ اتنی چھوٹی عمر کے بچّوں کو گھر سے علیحدہ کرنا بہت نئی سی بات ہے اور بہت سے گھر شاید اپنا فرض آپ انجام دینے کے قابل بھی ہوں۔ اس لیے فی الحال اگر اس عمر کے بچّوں میں دس میں سے دو ان تربیت گاہوں میں لے آئے

جائیں تو حساب کے اعتبار سے تو کم ہی ہیں مگر عملی لحاظ سے کافی ہوگا ان کے لیے علٰحدہ تربیت گاہیں کھول کر یا بنیادی مدرسوں کے ساتھ ان چھوٹے بچوں کے لیے علٰحدہ خاص انتظام کر کے حکومت اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتی ہے، بشرطیکہ مدرسے کے اس حصے کی دیکھ بھال کے لیے الگ تربیت یافتہ اُستاد بلکہ اُستانیاں فراہم کی جائیں اور بچوں کو صاف کھلی ہوا میں ایک اچھے باغیچے کے اندر گھر سے بہتر ماحول میں رکھنے کا انتظام ہو سکے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ تربیت گاہیں یا بالک باڑیاں اس لیے درکار ہیں کہ بہتیرے بچوں کو اچھا گھر نصیب نہیں۔ افلاس اور جہالت بیماری وغیرہ بچوں کو اکثر گھر کی حقیقی نعمتوں سے محروم رکھتے ہیں۔ اس لیے بھی ان تربیت گاہوں کی ضرورت ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اگر گھر وہ سب کچھ ہو جو اُسے ہونا چاہیے تب بھی وہ سب کچھ فراہم نہیں کر سکتا جس کا مطالبہ ننھے بچے کی نشو و نما پذیر اور تیزی سے نت نئی شکلیں اختیار کرنے والی طبیعت کرتی ہے۔ اس لیے ان نئی تربیت گاہوں کے بناتے وقت یہ بات سامنے رکھنی چاہیے کہ یہ گھر کا بدل بھی ہیں اور گھر کی کمیوں کو پورا کرنے والی بھی۔ بچے کی تربیت میں گھر کا وہ اثر ہے کہ اگر ان تربیت گاہوں نے گھر سے اپنا رشتہ مضبوط نہ کیا تو یہ اپنا کام بھی خوبی سے سرانجام نہ دے پائیں گی۔ ایک طرف ان کی واقفیت سے کام لینا ہوگا، دوسری طرف ماں کو بچے کی خدمت کی راہیں سجھانی اور

بھائی ہوں گی۔ اس کا کچھ بوجھ اپنے کندھوں پر لینا ہوگا تاکہ جو بوجھ اس کے ذمے رہے وہ اسے زیادہ خوبی سے اٹھا سکے۔ ان تربیت گاہوں کو طبی معائنے کا انتظام کرنا ہوگا اور وہ طبی امداد پہنچانی ہوگی جس کی بچے کو ضرورت رہتی ہے۔ انھیں بچے میں اچھی اچھی عادتیں ڈالنی ہوں گی اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں وہ اپنی عمر کے تقاضوں کے اعتبار سے وہ سیکھ سکیں جو فطرت چاہتی ہے کہ وہ سیکھ جائیں۔ وہاں طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام کرنا ہوگا، تعمیری بھی، تخئیلی بھی، تخلیقی بھی اور بچے کو اپنی بدنی نشو ونما کے لیے جس عمل اور حرکت کی ضرورت ہے اس کے مواقع بھی فراہم کرنے ہوں گے۔ آس پاس کی چیزوں کے خواص سے آگاہی کا سامان کرنا ہوگا۔ ان کے برتنے میں جو ہنر مندی درکار ہے اس کی بنیاد ڈالنی ہوگی اور بات چیت کرنے، اپنے ساتھیوں اور اپنے بڑوں سے اپنی کہنے اور ان کی سمجھنے کا خوگر بنانا ہوگا۔ پھر ۲، ۳ سال کی عمر ہی سے بچے کو ساتھیوں کی تلاش ہوتی ہے، خالی ماں کی رفاقت کافی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اردگرد اور بچے چاہتا ہے۔ ان سے سہارا لینا، انھیں سہارا دینا چاہتا ہے اور جماعتی زندگی کا تمدن آفریں بنیادی لین دین شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے بچے کو دوسرے بچوں کی صحبت اور رفاقت ملنی چاہیے اور یہ چیز یہ تربیت گاہیں اکثر گھروں سے زیادہ خوبی سے فراہم کر سکتی ہیں۔ البتہ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ساتھیوں کا یہ طبقہ کہیں بہت بڑا نہ ہو جائے۔ جب رفیق بہت زیادہ

ہو جائیں تو وہ بھائی بہن نہیں رہتے انبوہ بن جاتے ہیں جس میں بچہ کھو سا جاتا ہے اور جس سے اسے کبھی کوئی داخلی لگاؤ پیدا نہیں ہو پاتا۔ وہ اس انبوہ میں یا تو اندر کو کھنچ جاتا ہے، شرمیلا اور جھینپو بن جاتا ہے یا پھر لڑتا جھگڑتا ہے اور ہر ایک پر دھونس جمانے کی کوشش کرتا ہے، یا دب جاتا ہے یا دبانا چاہتا ہے۔ تعداد بڑھ جانے میں ننھے بچوں کے لیے متعدی امراض کا خطرہ بھی سخت خطرہ ہے۔ اس لیے تعداد کو کم ہی رکھنا ٹھیک ہے اور اس کا خیال اس وجہ سے اور بھی ضروری ہے کہ ہم کہیں اپنی مالی دشواریوں کے پیشِ نظر یا کام کو جلد جلد پھیلانے کی خاطر یہ نہ کر بیٹھیں کہ ان تربیت گاہوں میں بہت بہت سے بچوں کو یک جا کر دیں۔ میری رائے میں تو ایک تربیت گاہ میں ۳۰، ۴۰ سے زیادہ بچے نہیں ہونے چاہئیں۔

ان نئی تربیت گاہوں کو اگر واقعی گھر کا نعم البدل اور گھر کی کمیوں کو پورا کرنے والا بنانا ہے تو اس کی عمارت، اس کے باغیچے، اس کے کھیل کا انتظام، اس میں کھانا تیار کرنا اور کھانا کھلانے کا ستھرا اہتمام، اس میں بچوں کے پالتو جانوروں کی گنجائش، بچوں کے لیے صفائی اور طہارت کے مواقع، ان کے لیے بیچے اور ہلکے سازو سامان، غرض بہت سی باتوں کو سامنے رکھ کر ہر چیز کی جگہ نکالنی ہوگی۔ ہمارے ملک میں ابھی تعلیمی عمارتوں میں تعلیمی ضرورتوں کا خیال ذرا کم ہی رکھا جاتا ہے۔ ہر قسم کی عمارت ہر قسم کے کام میں لائی جا سکتی ہے لیکن ظاہر ہے

کہ یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ملک کے اچھے ماہرینِ تعمیرات و ماہرینِ تعلیمات باہمی مشورے سے ان تربیت گاہوں کے لیے نمونے کے نقشے بنائیں جنھیں مقامی خصوصیات کے پیشِ نظر کچھ بدل کر ہر جگہ کام میں لایا جا سکے۔ برطانیہ کی نرسری اسکول ایسوسی ایشن نے ۱۹۴۴ء کے قانونِ تعلیم کے پارلیمنٹ میں پاس ہونے سے پہلے ہی اپنی ایک کمیٹی بٹھادی تھی جس نے برطانیہ کے حالات سامنے رکھ کر ایک رپورٹ بھی شایع کر دی ہے جس میں ان نئی تربیت گاہوں کے لیے جو اس قانون کے تحت سارے ملک میں بننے والی ہیں، مکانات اور ساز و سامان سے متعلق تمام ضروری امور پر ماہرین کے مشوروں کا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ کاش ہم بھی اپنے کاموں میں اس پیش بینی کا ثبوت دے سکیں۔ کیوں نہ آپ کی فیلوشپ اس قسم کے کام اپنے ذمّے لے لے؟

آپ کی کانفرنس کے سامنے دوسرا بحث طلب مسئلہ ابتدائی تعلیم کا ہے، جسے آج کل ملک کی تعلیمی اصطلاح میں بنیادی تعلیم کہنے لگے ہیں۔ یہ ۵، ۶ سال سے اوپر کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ اس عمر کے لڑکے اور لڑکیوں میں سے کچھ کی تعلیم تو ہمیشہ جیسی تیسی ہوتی ہی رہی ہے لیکن جب تک تعلیم کا یہ کام نجی کام ہوتا ہے بچوں کے سرپرست اپنی مرضی اور بچے سے متعلق اپنے منصوبوں کے پیشِ نظر جس قسم کی اور جتنی تعلیم کا انتظام چاہتے ہیں کرتے ہیں یا استاد اپنی مرضی سے شاگرد کو جو چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس لیے تعلیم کے مقاصد اور اس کے طریقۂ کار

کے متعلق بہت اختلاف رہتا ہے۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں، جتنے راہی اتنی راہیں۔ لیکن جب تعلیم جماعت کا وظیفہ بن جاتی ہے تو جماعت قدرتی طور پر ہمیشہ یہ چاہتی ہے کہ تعلیم سے متعلّم کو اپنا کارآمد رُکن بنائے۔ اسے کارآمد بنانے میں جماعت کی طرف سے بڑی زیادتیاں ہو سکتی ہیں اور برابر ہوتی رہی ہیں۔ کارآمد بنانے کی خاطر آدمیّت کے حق چھین لیے جاتے ہیں، سانچوں میں کس کر ہر انفرادی خصوصیت کا جھول مٹا دیا جاتا ہے اور ایک سے ترشے ترشائے، ڈھلے ڈھلائے شہری بنانے کی خواہش کو بے روک ٹوک پورا کیا جاتا ہے۔ پر اگر جماعت کا نظام جمہوری ہو تو چوں کہ جمہوریت انسان کی بہ حیثیت انسان قدر کرتی ہے اس لیے اس کی انفرادیت کا پاس کرنے پر بھی مجبور ہوتی ہے۔ مگر کارآمد آدمی تو اسے بھی درکار ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کا تو وجود ہی اپنے شہریوں کی صحیح تعلیم پر منحصر ہوتا ہے۔ دوسرے اگر اپنے لیے کارآمد اور مطیع رعایا بنانے کی فکر میں رہتے ہیں تو اسے اپنے حقیقی آقاؤں کی تربیت کا کام انجام دینا ہوتا ہے۔ چنان چہ جہاں بھی جمہوری سیاسی ادارے فروغ پاتے ہیں تعلیم کو عام کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مفت انتظام کرنا ہوتا ہے اور چوں کہ معاملہ جماعت کے اچھی یا بُری جماعت بننے کا ہوتا ہے بلکہ اس کی موت و زیست کا ہوتا ہے اس لیے تعلیم کو بخت و اتفاق پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ لازمی بھی کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی جوں جوں سیاسی ارتقا جمہوریت کی طرف بڑھا ہے تعلیمی مسئلہ

جماعتی زندگی کا اہم ترین مسئلہ بنتا گیا ہے۔ اور اس وقت کہ ہم آزاد جمہوری حکومت سے بہت قریب ہیں، چاہے ایک متحدہ ہندوستان میں چاہے علیحدہ علیحدہ پاکستان اور ہندوستان میں، اس لیے اس بات پر شاید سب متفق ہوں گے کہ ہمیں اتنی مدت کے لیے جتنی جماعتی مقاصد کے پیشِ نظر ضروری نظر آئے، اپنے تمام لڑکے لڑکیوں کے لیے عام اور مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرنا ہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بھی سب کو اتفاق ہوگا کہ یہ مدت اگر ۴ یا ۵ ہی سال کی ہوئی تو کام نہ چلے گا اور خود مختاری اور جمہوری آزادی کا بوجھ اٹھانے والے شہریوں کی تیاری کے لیے فی الحال کم سے کم ۷ یا ۸ سال کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ اور آگے چل کر اس مدت کو شاید اور بڑھانا پڑے۔

لیکن یہ چیزیں جن پر میں نے کہا ہے کہ اتفاق ہے بس خارجی ڈھانچہ ہیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ تعلیم ہو کیسی؟ اس کے جواب کا سوچنا اور اسے صحت سے برابر قریب تر لانے کی کوشش جمہوری جماعت میں یوں تو سب کا کام ہے مگر خصوصیت کے ساتھ اس کے تعلیمی کام کرنے والوں کا فرض ہے۔ ہمیں اس کانفرنس میں بھی اس پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ہم یا جماعت کے اغراض کو پہلی جگہ دے سکتے ہیں یا فرد کی تعلیم پذیری کے امکانات کو۔ جماعت کی طرف سے تعلیم کا انتظام ہو، اس کی غایت جماعت کا استحکام اور اس کی ترقی ہو تو آسانی سے یہ ہو سکتا ہے کہ ہم جماعت کی ضرورتوں

ہی کو سامنے رکھ کر اس سوال کا جواب دے دیں۔ لیکن یاد رہے کہ اس میں بڑے خطرے ہیں۔ جمہوری جماعت بھی کوتاہ اندیشی سے بالکل پاک نہیں ہوتی۔ باوجود انفرادیت کے احترام کے دعووں کے جماعتی زندگی کی مزدوریں عملاً اس انفرادیت کا انکار کرا سکتی ہیں اور جمہوری تعلیمی نظام بھی آمری نظاموں کی طرح انسان کی انسانیت کو فنا کر کے اپنے شہریوں میں مشینوں کی سی کارکردگی پیدا کرنے کی تدبیریں کر سکتا ہے، وقتی فائدوں کے لیے مستقل مقاصد کو پس پشت ڈال سکتا ہے، حال پر مستقبل کو، دنیا پر آخرت کو قربان کر سکتا ہے۔ اس لیے صحیح راستہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم فرد کے نقطۂ نظر سے بھی تعلیم کی اہمیت پر غور کریں اور جماعت کے نقطۂ نظر سے بھی اور دیکھیں کہ اگر دونوں میں کوئی تضاد ہے تو وہ کیسے حل ہو۔ جہاں نہ ہو تو اسی صورت کو اختیار کیا جائے۔

تعلیم کے عمل میں فرد اور جماعت کے درمیان پہلے دن سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ تعلیم کا کام کرنے والے ہیں، آپ سے تو پوشیدہ نہ ہوگا کہ تعلیم یعنی واقعی ذہنی تربیت کیسے ہوتی ہے۔ ذہن اپنی نمو کے لیے جسم کی طرح غذا چاہتا ہے۔ یہ غذا اسے کہاں سے ملتی ہے؟ جماعت کے تمدن سے، اس کی مادی اور غیر مادی تحصیلات سے، اس کے علم سے، اس کی زبان سے، اس کے ادب سے، اس کی صنعت و دست کاری سے، اس کے نظام اخلاق سے، اس کے رسم و رواج سے، اس کی سماجی زندگی کے نمونوں سے، اس کے گاؤں، قصبوں، شہروں

کی تنظیمات سے، اس کی موسیقی سے، اس کی مصوری سے، اس کی تعمیرات سے، اس کی دوکانوں سے، اس کے کارخانوں سے، اس کی حکومت کے انتظامات سے، اس کی بڑی شخصیتوں کی زندگی کے نمونوں سے، غرض اس کی رنگا رنگ تخلیقات سے۔

جماعتی تمدن کی یہ ساری مادّی اور غیر مادّی چیزیں جو نشو و نما پذیر دماغ کے لیے غذا کا کام دیتی ہیں خود بھی کسی نہ کسی ذہنِ انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ کسی نہ کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں یہ روپ لیا ہے۔ کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں اپنی توانائی کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں انسانی ذہنوں کی بصیرتیں اور آرزوئیں اور کاوشیں ہی تو مضمر ہیں۔ یہ سب کسی متاعِ ذہنی رکھنے والے کا چھپا خزینہ ہے یا کسی سرِ شوریدہ کی بالین آسایش۔ غرض سب ذہنِ انسانی کی رہینِ منّت ہیں اور اس لیے سب کی اپنی اپنی ذہنی ساخت ہے۔

جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کی چھپی ہوئی قوتیں آشکار ہوتی ہیں۔ ان میں سوئی ہوئی توانائیاں اس نئے ذہن میں جاکر بیدار ہوتی ہیں۔ اس کے لیے یہ دفینے اپنا منہ کھول دیتے ہیں اور پُرسکون بالینوں سے اس کے لیے پھر شورِ ہائے و ہو اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر تربیت خواہ ذہن کے لیے ہر تمدنی چیز اپنی مخفی قوتیں پیش نہیں کرتی۔ جسمانی غذاؤں کی طرح ذہنی غذائیں بھی سب کو ایک ہی سی دا نہیں راس آتیں۔

کسی کو کوئی بھاتی ہے کسی کو کوئی۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ ہر ذہن کو وہی چیز بھاتی ہے جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت سے مطابق ہو۔ یہی تعلیم کا بنیادی گُر ہے۔ اس کو بھولنا یا اس کے خلاف چلنا ایسا ہے جیسے اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت دینے کی کوشش۔ جس دماغ کی ساخت ادبی کاوشوں کے نتیجوں کے مطابق ہو اسے صنعتی اشیاء تمدن سے، جس کی ساخت علمی اور نظری چیزوں سے مناسبت رکھتی ہو اُسے عملی چیزوں سے تعلیم دینا، یا اس کے برعکس، سب تعلیم کی ماہیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اصلی ذہنی تربیت کے دروازوں کو بند کر کے آدمیوں کو طوطوں اور سرکس کے جانوروں کا مرتبہ دینا چاہتی ہے۔

اچھا تو اس اصول کا تقاضا ۶، ۷ سال کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے لیے کیا ہے؟ اگر ایسا ہو کہ ہر لڑکے لڑکی کی تربیت ذہنی الگ الگ تمدنی اشیا ہی سے ہو سکتی ہے تو پھر کسی عام نظام کے بنانے کی دشواریاں ناممکن کی سرحد تک پہنچ جاتیں۔ عمومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کی خوش بختی ہے کہ اس عمر میں تفریق ذہنی پیدا ہونے سے پہلے عملی رجحان بچوں میں بہت عام بلکہ یوں کہیے کہ ہمہ گیر ہوتا ہے۔ اس عمر میں بچے چاہتے ہیں کہ کچھ بنائیں بگاڑیں، توڑیں جوڑیں۔ ان کے ہاتھ کام کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت ذہنی کے لیے اس عمر میں فطرت کا منصوبہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھوں کی مدد سے سوچیں، چیزوں کو

برت کر پہچانیں اور کام کر کے سیکھیں۔ یہ بڑی ہی گمراہی ہے کہ ہم اس عمر کے بچوں کے لیے ذہنی تربیت کے اس امکان کو یعنی عملی کام کو ان کی تعلیم میں جگہ نہیں دیتے۔ اور فطرت کے تقاضوں کو ٹھکرا کر اپنی من مانی تدبیروں سے اعلیٰ تربیت کی جگہ خالی ملمع کاری پر زور دیتے رہتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں دورائی کی ذرا گنجایش نہیں ہے کہ اس منزل میں عملی کام کو تعلیمی سعی کا مرکز بنایا جائے۔

تعلیم پانے والے اور ذریعۂ تعلیم میں مطابقت کے علاوہ اس منزل پر ہاتھ کا کام خود ذہنی کام کی، ذہنی ورزش اور ذہنی ورزش سے ذہنی نمو کی مفید ترین شکل ہے۔ اس کے ذریعے جو ہنرمندی اور جو واقفیت پیدا ہوتی ہے وہ ذہن کو جلا دیتی ہے۔ جو خالی کتابوں سے حاصل ہو وہ اکثر و بیشتر اس غرض کے لیے بے کار ثابت ہوتی ہے۔ ہم تعلیم کا کام کرنے والوں کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہر ہنرمندی اور ہر واقفیت ذہنی تربیت کی وجہ نہیں ہوتی۔ نہ اس کی علامت ہے نہ اس کا پیمانہ۔ واقفیت بھی دو طرح کی ہوتی ہے اور ہنرمندی بھی دو طرح کی۔ ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جس کے لیے دوسرے کام کرتے ہیں، ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے، خبر کی حیثیت سے۔ ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربے سے حاصل ہوتی ہے، جزو ذہن بنتی ہے، ذہن کو روشن کرتی، اس میں نظر پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح ایک ہنرمندی میکانکی ہنرمندی ہوتی ہے۔ اس میں سوجھ بوجھ کی

ضرورت نہیں، بس مشقت درکار ہے۔ جو کچھ پہلے سے مقرر ہے اس کی تکرار کرتی ہے۔ پہلے سے جو کچھ دوسرے نے معین کر دیا ہے اسے پیدا کرتی ہے۔ ایک ہنرمندی میکانکی نہیں ہوتی، ذاتی صلاحیت کی بنا پر نئی اقدار پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے تخلیقی ہنرمندی کہہ سکتے ہیں۔ روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور، اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے نہ روح کو بالیدگی۔ اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لیے ایک خوش نما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا۔ آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار، ذہن کو تربیت دیتا ہے، روح کی پرورش کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے۔ یہی حال میکانکی ہنرمندی کے مقابلے میں تخلیقی ہنرمندی کا ہے۔ حقیقی تعلیم یعنی ذہن کی سچی تربیت تجربے والے علم اور تخلیقی ہنرمندی دونوں کی خاطر اپنے بنیادی مدرسوں میں ہاتھ کے کام کو داخل کرنا اور اس سے صحیح تعلیمی کام لینا ضروری ہے۔

اس مطالبے سے بعض لوگ جھٹ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ پھر خبری کتابی علم اور میکانکی ہنرمندی کے لیے مدرسے میں کوئی جگہ ہی نہ ہونی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ زرا عجلت کرتے ہیں اور اصولوں کو زندگی کا خادم نہیں بناتے بلکہ زندگی کو نام نہاد اصولوں کا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ ایک صحیح بات کو مبالغے کے ساتھ پیش کرکے اسے

عمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ نہ ہر تخلیقی کام لازماً تعلیمی کام ہوتا ہے نہ ہر میکانکی کام کو تعلیم گاہ سے دیس نکالا دینا ہی لازمی ہے۔ نہ ہر تجربی علم تعلیم ہے نہ ہی سب کتابوں کو سپردِ آتش کرنا ضروری۔ ذرا تامل کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمی اعتبار سے بارآور کام وہ ہوتا ہے جس میں پہلے کام کرنے والے کو مسئلے کا واضح احساس ہو، وہ اپنے کام کا ذہنی خاکہ بنائے، اس کے وسائل سوچے، کام کی ممکن راہوں میں سے کسی ایک کو بوجوہ منتخب کرے، پھر اس کام کو کر گزرے، کرنے کے بعد اپنے ابتدائی منصوبے اور خاکے کو سامنے رکھ کر اسے جانچے، اس کی خوبی پر خوش ہو اور اس کی غلطیوں سے سبق لے اور آئندہ بہتر طریق پر اسے انجام دینے کے لیے آمادہ ہو۔ تعلیمی کام میں یہ منزلیں ضروری ہیں۔ یہی اس کام کو تربیتی صفت بخشتی ہے۔ خبری علم اور میکانکی کام میں یہ منزلیں نہیں ہوتیں اس لیے وہ صحیح تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ لیکن پھر بھی تعلیمی کام میں ان کے لیے جگہ ہے اور بعض اعتبار سے خاص اہم جگہ۔ ہوتا یہ ہے کہ حقیقی تعلیمی کام کے سلسلے میں کام کرنے والوں کو بہت سی ایسی واقفیت درکار ہوتی ہے جسے سب کو اگر وہ تجربے ہی سے حاصل کرنا چاہیں تو عمر بیت جائے۔ بہت سے تخلیقی تعلیمی کاموں میں ایسی ہنرمندیوں کی ضرورت پڑتی ہے کہ اگر وہ پہلے سے حاصل کر کے میکانکی طور پر کام میں نہ لائی جاسکیں تو یہ منصوبہ پورا ہی نہ ہو سکے۔ ایسی صورتوں میں میکانکی مہارت اور

خبری علم تجربے اور تخلیق کے منصوبوں میں مددگار کی حیثیت سے شامل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی حیات پرور صحبت میں ان کی مردنی بھی زندگی کی معین ہو کر انھیں زندگی بخش دیتی ہے۔

تعلیمی کام کی جو خصوصی منزلیں میں نے اوپر بیان کیں وہ خالص ذہنی کام میں بھی ہو سکتی ہیں، اخلاقی فیصلوں میں بھی، ادبی کاوشوں میں بھی اور ہاتھ کے عملی کام میں بھی۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن ادنیٰ تأمل سے واضح ہو جائے گا کہ ہاتھ کے کام میں یہ منزلیں بہت وضاحت سے کام کرنے والے کے سامنے آسکتی ہیں۔ اس لیے اگر ہم تجربی علم اور تخلیقی ہنر مندی کو حقیقی مانیں تو اپنے ان بنیادی مدرسوں میں ہاتھ کے کام سے یہ تربیتی خدمت لینے کی تدبیر کرنا اور بھی ضروری ہے۔

یہ جو عملِ تعلیم کی ماہیت، تعلیمی کام، تجربی علم اور تخلیقی ہنر مندی کی تربیتی قوت کے تقاضوں سے ہم فرد کی پوری ذہنی نشو و نما کی خاطر ہاتھ کے کام کو بنیادی مدرسوں میں رواج دینا چاہتے ہیں حسنِ اتفاق دیکھیے کہ جماعت کے مفاد کا مطالبہ بھی یہی ہے۔ جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنی زندگی کا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے اس کی تعلیم گاہیں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی وقت ممکن ہے

جب یہ مدرسے گنتی کے چند خودغرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سوادِ اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں۔ کہیں اور یہ جائز ہو کہ نہ ہو لیکن ایک جمہوری جماعت میں تو یہ ایک ناقابلِ تصور اقدام ہے۔ ہاتھ کے کام کو مدرسے میں جگہ دے کر یہ جمہوری جماعت دراصل وہ کام انجام دے گی جو اس کا پہلا تعلیمی مقصد ہو سکتا ہے یعنی کارآمد شہری پیدا کرنا کہ جمہوریت کی روح، فرد کا احترام باقی رہے، فرد اس طرح کارآمد ہے کہ اپنی انفرادیت کو بھی اسے تجنا نہ پڑے اور اپنے انفرادی ترقی امکانات سے بھی محروم نہ کیا جائے۔

اچھا۔ اگر ہم نے فرد اور جماعت کے تعلیمی مطالبوں میں یہ ہم آہنگی پاکر اپنے بنیادی مدرسوں کو کام کا مدرسہ بنا دیا اور ان میں تجربی علم اور تخلیقی کام اور ان کے معاون بلکہ خادم کی حیثیت سے کتابی علم اور میکانکی کام کا ایک ایسا آمیزہ تیار کر لیا جس سے ۶، ۷ سے ۱۴ سال کے لڑکے لڑکیوں کی ذہنی ورزش کا کام اچھی طرح انجام پا سکے تو کیا ہم نے سب کچھ کر لیا جو ان کی تعلیم کے لیے کرنا ہے؟ خیر سب کچھ تو یوں بھی کوئی کبھی نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم نے تو شاید ابھی اپنا سب سے اہم کام نہیں کیا ہے۔ ہم نے اگر ذہنی قوتوں کو نشو و نما دینے کا انتظام کر دیا، اگر ہنرمندیاں پیدا کر دیں، تو تعلیم کا کام ختم نہیں ہو گیا صلاحیتیں اور ہنرمندیاں نہ اچھی ہوتی ہیں نہ بری۔ وہ اچھی اور بری بنتی ہیں۔ ان مقاصد سے جن کی خدمت میں لگائی جاتی ہیں۔ آپ کی عدالتوں

میں جھوٹ کو سچ بنا کر روپیہ بٹورنے والے، آپ کے تجارتی فرموں میں کالی منڈی کے لال سوداگر اور جماعتی محاصل کے چور، آپ کے عہدے داروں میں رشوت کا بازار گرم کرنے والے، آپ کے پبلک کام کرنے والوں میں ذاتی غرض پر عام مفاد کو چٹکی بجانے میں قربان کرنے والے، آپ کے عالموں اور پنڈتوں، آپ کے جوگیوں اور صوفیوں میں عام مخلوق کے جہل اور توہم پرستی سے بے دریغ ناجائز فائدہ اٹھانے والے، آپ کے جھوٹے گواہوں اور جعل سازوں کے بامراد دل یہ سب کچھ صلاحیتوں اور ذہنی مہارتوں میں کسی سے پیچھے تو نہیں ہیں۔ کیا ہم اپنے مدرسوں کو ذہنی صلاحیتوں کے چمکانے اور مہارتوں کے پیدا کرنے کا ادارہ بنا کر ان میں انھیں فوجوں کے لیے رنگروٹ حاصل کرنا چاہیں گے؟ نہیں، تعلیم مہارتوں سے نہیں ہوتی، مہارتوں کو اچھے مقاصد کا خادم بنانے سے ہوتی ہے۔ جمہوری جماعت میں اس حقیقت کو نظر انداز کرنا جماعت کی زندگی کی شرائط سے غفلت برتنا ہے۔ جب تک فرد اپنی قوتوں کو جماعت کی خدمت کے لیے صرف کرنا نہ سیکھے اس وقت تک اس کی ہنرمندی جماعت کے انتشار کا باعث بن سکتی ہے۔ اور خصوصیت سے جمہوری ریاست میں جو تحقیق و تفتیش کی آزادی ہے، جماعت کی آزادی ہے، تقریر و تحریر کی آزادی ہے، مشاغل کے انتخاب کی آزادی ہے، ان سب سے انفرادیت کی انتشاری قوتیں ابھرتی ہیں۔ جو ان آزادیوں کی قدر کرتے ہیں اور جمعیت کی خاطر انھیں ہاتھ سے

دینے کو بہت گراں سودا جانتے ہیں۔ لیکن جنھیں جماعتی زندگی کا انتشار بھی گوارا نہیں۔ انھیں ان آزادیوں کے ساتھ ساتھ ذہن جماعتی کے نشوونما اور جمعیت قومی کے استحکام کی تدبیریں بھی سوچنی چاہئیں انھیں دیکھنا چاہیے کہ مدرسہ ایک جماعتی ادارے کی حیثیت سے اس باب میں ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ آج تو وہ تعلیم سے انفرادیت کو چلاتا ہے۔ اس لیے کہ سب کے واسطے وہ راہ متعین کرتا ہے جو بہت کم کی صحیح راہ ہو سکتی ہے، تعمیر اور تخلیق کے لیے بے چین بچوں کو کتابوں پر جھکاتا ہے، ان اوزاروں کی جگہ جن کی طرف بچوں کی للچائی نظریں تکتی ہیں انھیں قلم دوات دیتا ہے، اچھلنے کودنے کے لیے بے تاب بچوں کو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک طرف تو انفرادیت کے ساتھ یہ بے اعتنائی، دوسری طرف خودغرضی کی راہوں پر انھیں چلانے کے لیے وہ اہتمام کہ الاماں۔ اپنے مدرسوں کے نصاب کو، ان کے کاموں کو ذرا غور سے دیکھیے اور ان کی تحلیل کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں شاید ایک ہی کاروبار ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ افراد کی ذہانت، ان کی قوت آزادی، ان کی ہنرمندی سب بس فرد ہی کے لیے نشوونما پائیں۔ جماعتی محرکات کو بر روئے کار آنے کا نہ موقع ملتا ہے، نہ وہ ابھرتے ہیں، نہ تربیت پاتے ہیں۔ ذہن کو بیدار کیا جاتا ہے، دل کو سلایا جاتا ہے۔ حقوق یاد رہتے ہیں، فرائض بھلائے جاتے ہیں۔ انفرادی غرض طلبی کی ڈھلوان شاہراہ پر بچے ڈھکیلے جاتے ہیں، جماعتی بے غرضی

اور خدمت کے دروازے بند رہتے ہیں۔ دوسرے کو کہنی مار کر آگے بڑھ جانے کی ہر دم مشق مہیا ہے، ساتھی کو سہارا دے کر آگے بڑھانے کا کہیں نام نہیں۔ سب اپنے اپنے لیے ہیں، سب کے لیے کوئی نہیں۔ ہاں زبان سے کبھی کبھی قومی خدمت، پڑوسی کے حقوق، باہمی تعاون کی تلقین ہو جاتی ہے۔ لیکن کرنے کے کام باتوں سے انجام نہیں پاتے۔ کردار کی عادتیں گفتار سے پختہ نہیں ہوتیں۔ زندگی سے حقیقی تعلق خیال اور احساس کے علاوہ عمل کا طالب بھی ہے۔ جماعت کے لیے اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ خدمت انجام دینے میں اس کی نشوونما کا راز ہے۔ اچھی جماعت اپنے افراد کو اس کا موقع دیتی ہے کہ وہ مل کر اس کے لیے کچھ کریں اور اس پر خوش ہو سکیں۔ اچھا مدرسہ بھی جماعتی کام کی مشترک خوشی کے مواقع نکالتا ہے۔ کام کے کامیابی سے انجام پانے پر خوشی تو انفرادی سعی میں بھی ہوتی ہے مگر وہ جماعتی مقاصد سے بے تعلق ہوتی ہے۔ کام کی اس انفرادی مسرت کو کہ خود غرضانہ انجن ہے جماعتی مقاصد کی پٹری پر ڈال دینا چاہیے۔ انفرادی عمل کی خوشی کو جماعتی کام کی لگن اور اس پر سرور اور فخر میں بدل دینا چاہیے۔ یوں جماعت سے فرد کا تعلق فرد کے لیے وجہ مسرت و افتخار بن جاتا ہے اور فرد اور جماعت کی گتھی فلسفیانہ بحثوں کے بغیر کھل جاتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مشترکہ کام کی مسرت کس قسم کے کام سے

حاصل ہوسکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس وقت نصیب ہوتی ہے جب کام
کام کرنے والے کی صلاحیت، اس کے رجحانات، اس کی طبیعت کے
جھکاؤ کے مطابق ہوں۔ اور صاحبو، آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ
یہ صلاحیت کیا ہوتی ہے اور یہ جھکاؤ کدھر ہوتا ہے۔ کتابوں کی طرف
ہوتا ہے یا عملی کام کی طرف چناں چہ انفرادی رجحان اور قومی مصالح
دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے کتابی مدرسے عملی کام کے مدرسے
بن جائیں۔ اس پہلے قدم سے پورا فائدہ اُٹھانے کے لیے دوسرا قدم
یہ ضروری ہے کہ عملی کام کی انفرادی خواہش کو مشترک جماعتی کاموں میں
لگانے کا انتظام کیا جائے، اور مدرسے کو کام کی جمعیت کی حیثیت
دے دی جائے۔ اور جب خود غرضانہ عمل کا جذبہ جماعتی خدمت میں
منتقل ہو جائے، ایک نظم کے ماتحت اپنے کو لائے، دوسرے کی مدد
کرنے، دوسرے سے مدد لینے کی عادت پڑنے لگے اور ذمّے داری کا
احساس پیدا ہو جائے تو تیسرا قدم یہ ہے کہ عادتوں کو بصیرتوں میں
بدلا جائے۔ اس مشترک عمل کے جماعتی محاسن اُجاگر کیے جائیں اور
شخصی اور جماعتی اغراض کے ساتھ ساتھ پورا ہو سکنے کے امکانات
واضح کیے جائیں۔ اور چوتھا قدم یہ ہے کہ متعلمین کے اکثر انتظامات
خود ان کے ہاتھ میں دے دیے جائیں۔ ذمّے داری کا احساس اور
اپنے کام کو اپنے بس بھر بہترین طرز پر انجام دینے کی عادت آزاد
اور پیہم عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ مدرسے کی ہم آہنگ فضا میں

مشفقانہ نگرانی اور مشورے کے ساتھ یہ سب منزلیں خوبی سے طے ہو سکتی ہیں اور مدرسہ اس خود مختار جمہوری ریاست کا جو اسے چلاتی ہے سب سے مفید ادارہ بن سکتا ہے اور اس ریاست کو بہتر ریاست بنانے میں سب سے زیادہ مؤثر قوت ثابت ہو سکتا ہے۔

صاحبو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اپنے بنیادی مدرسوں میں یعنی اپنی قومی تعلیم کے سب سے اہم حصے میں اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو بس کرنے کی چیز یہی ہے کہ ان مدرسوں کو خبری علم کے مرکزوں کی جگہ تجربی علم کے مدرسے بنانا چاہیے، کتابوں کے مدرسے کی جگہ کام کا مدرسہ بنانا چاہیے۔ انفرادی خودغرضی کی جگہ بے غرض جماعتی خدمت کی تربیت گاہ بنانا چاہیے؛ ادبی و نظری یک طرفہ پن کی جگہ ان میں زندگی کے عملی تنوع کو جگہ دینی چاہیے۔ یہ مشکل کام ہے مگر ضروری کام۔ ہمارا مستقبل اس منصوبے کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کام میں آپ کے بہت سے مددگار ہوں گے اور اس سے زیادہ رکاوٹ ڈالنے والے۔ لیکن یہ کام انجام اسی وقت پا سکتا ہے جب اُستاد اپنے فرض کو جانیں اور تعلیم کے معاملے میں اپنے منصب کو پہچانیں۔ مجھے یقین ہے کہ "نیو ایجوکیشن فیلوشپ" کے اراکین اس میدان میں اور سب سے آگے ہوں گے۔

سیرت کی تربیت

(یہ وہ خطبہ ہے جو ۲۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو صادق ایجرٹن
کالج بھاول پور کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھا گیا)

جناب صدر اور حضرات!

میں اپنے محترم کرم فرما عالی مرتبت وزیر صاحب تعلیمات[1] اور اپنے عزیز دوست پیرزادے صاحب[2] کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقع پر یاد فرمایا اور اس جلسۂ تقسیمِ اسناد میں اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو مخاطب کرنے کا شرف بخشا۔ اس لیے اور بھی شکر گزار ہوں کہ اس دعوت نے پہلی بار ریاست بھاول پور میں حاضری کا موقع دیا، جس کے بیدار مغز حکمراں کے نام سے اس خاندانِ عباسی کی یاد تازہ ہے جس کی خدمت گزاری کو عدل و انصاف اور علم و حکمت کبھی فراموش نہ کریں گے۔

---

[1] عالی مرتبت میجر شمس الدین صاحب

[2] پیرزادہ عبدالرشید صاحب پرنسپل بھاول پور کالج

خدا انھیں اپنی مخلوق کی خدمت کی توفیق اور علم و حکمت کی دست گیری کی سعادت سے مالامال فرمائے۔ بغدادِ جدید[1] میں آ کر اگر اس بلدۂ مبارک کی یاد آئے تو کیا عجب ہے:

پڑی خاکِ ایتھنز میں جاں جہاں سے
ہوا زندہ پھر نامِ یوناں جہاں سے

جہاں برابر

حریمِ خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر
وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں
وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم، سولن کے قانوں
پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہرِ سکوت ان کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بو اس کی پھوٹی

اس خاندانِ خلافت اور اس فخر البلاد بغداد کے ساتھ نسبت سے یہاں کی حکومت اور خصوصاً یہاں کے علمی اور تعلیمی کام کرنے والوں کی ذمے داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ خدا انھیں اس کے اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[1] یہ خطبہ "بغدادِ جدید" بہاول پور میں پڑھا گیا تھا۔

اور آپ سب کو بھی، اے عزیزانِ جواں ہمت! اس کا ولولہ اور اس کی ہمت عطا ہو کہ آپ اس بغدادِ جدید کو اس پرانے بغداد کا ہمسر بنانے کے لیے کمربستہ ہو جائیں، اس کے علمی شغف اس کی بے تعصبی، اس کی وسیع الخیالی کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں اور اپنے بس بھر کچھ کر دکھائیں۔ تمدنی زندگی میں دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے۔ تعلیم و تربیت کی قلمرو میں تو ماضی کی تمام تحصیلاتِ ذہنی آنے والی نسلوں کی میراث ہوتی ہیں۔ یہی ذہنی زندگی کے لیے بمنزلۂ غذا ہیں، یہی ذہنی ارتقا میں بامِ ترقی کا زینہ۔ ماضی کی تحصیلات میں کہ سب کی سب کسی نہ کسی کاوشِ ذہنی ہی سے تو عبارت ہوتی ہیں، انسانی ذہن اپنی قوتوں اور توانائیوں کو سلا سا دیتے ہیں، چھپا دیتے ہیں، محفوظ کر دیتے ہیں۔ جب کوئی دوسرا ذہن، جس کی ساخت کو اس ذہنی کاوش سے کچھ مناسبت ہو جس نے ذہنی قوتوں کو ان اشیاء تمدن میں بطور خزینہ چھپا کر محفوظ کیا ہے، ہاں جب کوئی دوسرا ذہن ان اشیائے تمدن سے دوچار ہوتا ہے تو یہ پوشیدہ قوتیں آشکار، خوابیدہ توانائیاں بیدار ہو جاتی ہیں اور تربیتِ ذہنی کا کام انجام دیتی ہیں۔ اس لیے اگر تعلیم والے ماضی کی تحصیلات سے بیزاری ظاہر کریں تو سچ یہ ہے کہ وہ، شاید بے جانے، عملِ تعلیم کی ماہیت سے بے خبری کا اقرار کرتے ہیں۔ تعلیم تو نام ہی ماضی کے ذہنِ معروض کو حال کے ذہنِ موضوع میں منتقل اور بیدار کرنے کا ہے۔

ہاں، اس سے کوئی یہ سمجھ لے کہ حال اور مستقبل ماضی کی تحصیلات سے

آگے قدم نہیں بڑھا سکتے تو بڑی ہی بھول ہوگی، اس لیے کہ یہ تو ذہنی ارتقا کے سفر کو بیچ میں ہی قطع کر دینا ہوا۔ ذہن بے شک ذہن کی پچھلی کاوشوں ہی سے تربیت پاتا ہے اور غذا حاصل کرتا ہے، لیکن جب تربیت پا چکتا ہے تو ذہنی تشکیلات کے بے شمار امکانات اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ قدامت پرستی اور جمودِ ذہنی اگر اس وسیع میدان کو تنگ کرنا چاہیں تو گویا ایک جوان حوصلہ مند فرس کو کولھو کا بیل بنانے پر اصرار کرتے ہیں۔ زندگی ہردم نئے مسائل سے دوچار ہوتی ہے، اس کا دھارا ایک لمحے کے لیے کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتا، حالات کا تغیر نئے انتظام چاہتا ہے، نئے اداروں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک نئی کل کی ایجاد، ایک نئی قوتِ محرکہ کا انکشاف سارے نظام دولت آفرینی کو درہم برہم کر دیتا ہے، تقسیم عمل اور تنظیم کار کے سارے نقشے پلٹ جاتے ہیں، زندگی کا ڈھنگ ہی اور ہو جاتا ہے۔ ایک نیا تصورِ حیات سیاسی اور معاشرتی زندگی کی بنیادوں تک کو ہلا دیتا ہے اور ایک نئی عمارت کی نئی داغ بیل ڈالنے پر مجبور کرتا ہے، ایک کلمۂ پاک اپنی جڑوں کو ضمیرِ انسانی میں مضبوط جما کر اپنی شاخیں آسمان تک پہنچ سکتا ہے، ایک اچھی زندگی کا اسوۂ حسنہ ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کے لیے رحمت بن جاتا ہے، ایک گندا خیال، ایک فاسد گمراہ فریب تصورِ زندگی مدتوں تک زندگی کے چشموں کو مسموم کر سکتا ہے، ایک خودغرضی، ایک ہٹ، ایک کوتاہ اندیشی بسا اوقات

قوموں کی قوموں کے لیے زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے۔ جس زندگی کا توازن اتنا نازک ہو اس کے مطالبوں سے جامد ذہن عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ماضی منزل نہیں، رختِ سفر فراہم کرنے کا مخزن ہے۔ بغداد کے کارناموں سے آنکھیں بند کر لینا تو اپنی میراث کو ٹھکرانا ہے، سفر پر بغیر سامانِ سفر کے چل کھڑا ہونا ہے، لیکن سفر بغداد سے بغداد کا نہیں ہے۔ جو بنانا ہے وہ وہ نہیں جو بنایا جا چکا ہے۔ بنانا پھر سے بغداد نہیں ہے بغدادِ جدید بنانا ہے۔

اس نئی زندگی، اس نئے آئین، ان نئے اداروں، اس نئے تمدّن اس نئے بغداد کے معمار آپ ہی نوجوان ہوں گے۔ اس تمدّنِ جامعی کی تعمیر کا ایک دشوار مگر نہایت حکیمانہ مطالبہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ معمار خود اپنی تعمیر بھی کرے۔ قدرت نے جو صلاحیتیں، جو قوتیں، جو جبلتیں، جو استعدادیں، جو میلانات، جو خواہشات اسے ارزانی فرمائی ہیں ان کے بے ترتیب انبار میں نظم و ترتیب پیدا کرے، ان میں یک جہتی اور یک سوئی کی تدبیر کرے اور اپنی بے ترتیب انفرادیت سے ایک مرتب سیرت بنائے اور اس سیرت کو بالارادہ اقدارِ عالیہ مطلقہ سے وابستہ کر کے آزاد اخلاقی شخصیت کے مرتبۂ بلند پر پہنچائے۔ انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت، یہ ہے ان معماروں کی تعمیر کا راستہ۔

ان تصورات کی وضاحت کا یہ وقت نہیں، صرف اتنا اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی بڑی ضرورت

ہوتی ہے: ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، اجتہادِ فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حس جماعتی کی ایک کم سے کم ذکاوت، اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائیداری۔ ان چاروں کے متعلق کچھ کچھ عرض کردوں تو شاید بے سود نہ ہو۔

آدمی کے ارادے میں اس کی انفرادیت کی چار صفتیں بروئے کار آتی ہیں، دو ارادے سے پہلے، دو ارادے کے بعد۔ ارادے سے پہلے تو اس کی خود مختاری اور اس کی قوتِ فیصلہ آشکار ہوتی ہیں، ارادے کے بعد اس کی مضبوطی اور اس کا ثبات۔ خود مختاری جب ظاہر ہوتی ہے کہ ارادہ خود کیا ہو، دوسرے نے کرکے ہمارے سر نہ تھوپ دیا ہو۔ جن طبائع میں خود اپنے بل پر ارادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جو ہمیشہ کسی اور ہی کا منہ تکتے ہوں، ان میں بھلا سیرت کی یکسوئی کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ قوتِ فیصلہ سے ارادہ بر وقت بن جاتا ہے، ورنہ اگر فیصلے میں برابر لیت و لعل ہی ہوتی رہے تو ارادے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ نیک نیتی تسویف کے چکر سے عمل کے میدان میں نہیں آسکتی اور سیرت کی تعمیر میں یہ تسویف بہت حائل ہوتی ہے۔

دوسری دو صفتیں جن کا ذکر ہوا ارادہ کر چکنے کے بعد اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مضبوطی سے یہ ہوتا ہے کہ فیصلے کے بعد ارادہ کرنے والا اندرونی کشاکش سے مامون ہوجاتا ہے۔ ورنہ ہر فیصلے کے بعد

نظرِثانی و نظرِثالث کا سلسلہ جاری رہے تو عمل کی نوبت ہی نہیں آتی اور قوتِ ارادی بے عملی سے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسری صفت، یعنی ثباتِ قدم، ارادے کو خارجی رُکاوٹوں اور مخالف قوّتوں کے اثر سے بچاتی ہے، ورنہ کتنے نیک ارادے ہیں کہ حالات کے نامساعد ہونے کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتے اور عمل کا جامہ پہننے سے پہلے بدل دیے جاتے یا بالکل ترک کر دیے جاتے ہیں۔

قوتِ ارادی کی مضبوطی کے کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں، جن میں تغیّر کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن بعض پر مشق اور بصیرت سے اثر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ چناں چہ ہوشیار معلّم اپنے بچّوں سے ایسے کام کراتے ہیں جن میں خاطر خواہ نتیجہ نکلنے سے حوصلہ بڑھتا ہے، یعنی ارادہ کرنے کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے اور بچّہ شوق سے دوسرے مشکل کاموں کا عزم کر سکتا ہے۔ ارادے کی قوت کے اندازے میں ایک بات نوجوانوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنی چاہیے وہ یہ کہ ارادے کی قوت اس کی ابتدائی شدّت سے عبارت نہیں، اس لیے کہ کتنے کام ہیں جو ایک ہی کوشش میں پورے ہو سکیں اور کون سی سرسوں ہے جو ہتھیلی پر جم جاتی ہو؟ مضبوط ارادہ دراصل شدّت اور مدّت کا حاصل ضرب ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہماری قومی زندگی کے تعمیری کام تقریباً سب کے سب بہت دیر طلب اور صبر آزما کام ہیں اور ہماری قومی

زندگی کے روگ اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ ان کو دور کرنے میں سالہا سال پتّا مار کر مصروف ہونا ضروری ہے۔ قومی خدمت کا ارادہ کرنے والے نوجوان اگر فرطِ جوش میں ان میں سے کسی کو دور کرنے کا قصد کرلیں اور اس گمان میں ہوں کہ بس ایک ہلّے میں قلعہ سر ہو جائے گا تو انھیں بڑا دھوکا ہوگا اور عجب نہیں کہ مایوسی قوائے عمل کو شل کر دے اور آئندہ عزم کی راہ میں ایک بڑا سنگِ گراں حائل ہو جائے۔

سیرت کی تعمیر کے لیے دوسری شرط قوتِ فکر ہے منطقی طور پر سوچ سکنے کی صلاحیت، صحیح نتیجے پر پہنچ سکنے، نتائج کو پرکھ سکنے کی استعداد۔ جس کا ذہن صاف نہ ہو اور ٹھیک سوچ سمجھ نہ سکے وہ بھلا عمل میں یک سوئی کیسے پیدا کرے؟ بس اتفاقی تجربی معلومات اور عادت کی لکڑی کے سہارے چند قدم چل سکتا ہے، جیسے اندھا ٹٹول ٹٹول کر چلے، لیکن اس ہر لحظہ متغیر دنیا میں قدم قدم پر غیر متوقع حالات اور غیر معمولی کیفیات سے سابقہ پڑتا ہے، جسے عقل فیصلہ کرنے میں مدد نہ دے سکے وہ فیصلہ ہی نہیں کرتا اور دعوتِ عمل کو اس کان سے سن کر اس کان سے نکال دیتا ہے یا بخت واتفاق کے سہارے ڈگمگاتا آگے بڑھتا ہے، ایک عمل اور دوسرے عمل میں مطابقت نہیں ہوتی، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا پیچھے پڑتا ہے۔
منطقی استدلال اور حکمی فکر کی صلاحیت کسی میں پیدائشی طور پر نہیں ہوتی، اس کے لیے شعوری مشق کرنی ہوتی ہے، ارادہ کرکے اس کی

عادت ڈالنی ہوتی ہے کہ ہر نتیجے پر جرح کی جائے، اسے جانچا جائے، پرکھا جائے۔ یہی نہیں، کوشش کر کے ان فطری موانع کو معدد کیا جائے جو منطقی فکر کی عادت میں قدم قدم پر حائل ہوتے ہیں۔ جذبات کے طوفان، تعجیل کی پھسلن، نفس کے وسوسے، خودغرضی کے فریب، غیر عقلی وابستگیوں کی خیرگی، تعصبات کے اندھیرے، اس فکرِ منطقی کی راہ میں کیا کچھ حائل نہیں! پھر اگر راستے کے ان جھاڑ جھنکاڑوں کو پیہم کوشش سے دور بھی کر دیا تو یہ مشکل سامنے آتی ہے کہ منطقی سوچنے کی کوئی ایسی عام صلاحیت نہیں کہ اسے نشوونما دے لی تو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح منطقی نتائج پر پہنچنے کی ضمانت ہو گئی، بس ہر قضیئے پر شبہہ کرنے اور سے پرکھنے کی عادت راسخ کی جا سکتی ہے۔ مگر علمی مسائل پر مشق عملی سوالوں کے حل میں معتبر نہیں رہتی، نظری ورزش ذہنی اخلاق کے میدان میں کام نہیں آتی۔ اخلاقی مسائل میں منطقی استدلال کی ضرورت ہو تو کچھ اخلاقی تصورات اور اخلاقی اصول بھی تو پہلے سے موجود ہونے چاہئیں۔ اور اصول ہی کافی نہیں، ان پر عمل کرنے کا موقع بھی ہونا ضروری ہے۔ اخلاق کی دنیا میں یہ معلوم ہونے سے کہ نیکی کیا ہے آدمی نیک تو نہیں ہو جاتا، نیک بننے کے لیے نیکی کرنا بھی تو لازم ہے۔

آپ جس زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں اس میں منطقی فکر کو فریب دینے والے ہر ہر قدم پر ملیں گے۔ سیاسی اور مذہبی نجات فروشوں کی صدائیں، وقت کی سہانی راگنیاں، مرغوبِ عام، مقبولِ عوام، سطحی دلیلیں، ناممکن

مطالبے، ضدیں، ہٹ دھرمیاں، جماعتی خود غرضیاں، یہ سب اور نہ جانے اور کیا کیا اور کون کون آپ کو صحیح نتیجوں پر پہنچنے سے روکیں گے۔ آپ کو اگر اپنی سیرت کی تعمیر عزیز ہوگی تو آپ ان کا مقابلہ کریں گے، ان کو رد کرنے میں جو ذہنی کوفت ہوگی اُسے اپنے لیے گوارا بنائیں گے، اپنے فکر کی نگرانی اسی طرح کریں گے جیسے چوروں اور ڈاکوؤں سے کسی متاعِ عزیز کی، اور سیرت سازی کی اِسی شرطِ دوم کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ورنہ شاید آپ اس مشقت سے تو بچ جائیں جو منطقی فکر کی تربیت میں ضروری ہے، شاید آپ بہتوں کو خوش بھی رکھ سکیں لیکن آپ آپ نہ بن پائیں گے، دوسروں کا عکس رہیں گے، اور انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت کا سفر منزل سے پہلے پہلے ختم ہو جائے گا۔

سیرت کی تربیت کے لیے تیسری شرط اشیا اور اشخاص سے دوچار ہونے میں ذکاوتِ حس کا ایک کم سے کم درجہ ہے۔ یہ نہ ہو تو سیرت کی تربیت بہت دشوار ہوتی ہے۔ حواسِ ظاہری کے فعل میں معروف بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی وہ سب سُنتا ہے جس کے لیے دوسروں کے کان بہرے ہوتے ہیں، کوئی رنگ کے وہ فرق دیکھتا ہے جو دوسروں کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، وہ سونگھتا ہے جو دوسرے نہیں سونگھتے، وہ مزے چکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں چکھ سکتے، چھوکر وہ محسوس کر لیتا ہے جو دوسرے محسوس نہیں

کرتے۔ مصوّر، ماہرِ موسیقی، موتی پرکھنے والے، جواہرات کے بیوپاری، چاک پر کمہار، معمل میں سائنس کے کہنہ مشق محقق، یہ سب اپنی ذکاوتِ حِس سے دوسرے بنی نوع کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا نفس تعلقاتِ انسانی میں بھی ایسی ذکاوتِ حِس کا ثبوت دیتا ہے کہ دوسرے ششدر رہ جاتے ہیں۔ کچھ انسان حساس ہوتے ہیں کچھ بے حِس سے، کچھ بہت تیز، کچھ بہت کُند، کچھ ذکی، کچھ غبی۔ بعض بہت جلد دوسروں کو سمجھ لیتے ہیں، آسانی سے ہمدردی کرتے ہیں، جبلّی طور پر دوسرے کا خیال کرتے ہیں، اشاروں میں مطلب بھانپ جاتے ہیں، دوسرے کے مافی الضمیر تک آن کی آن میں پہنچ جاتے ہیں، بعض اس کے بالکل برعکس۔ انسانوں اور چیزوں کو برتنے کا موقع ملتا ہے تو یہ صفت آسانی سے نشوونما پاتی ہے، کتاب کے کیڑے اور خبری علم کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگ بسا اوقات اس سے محروم ہوتے ہیں۔ زندگی کی ناکامیاں، بچپن میں دل شکستگی، آلام روزگار کا بوجھ آدمی کو اکثر اس ذکاوت سے محروم کردیتے ہیں۔ خود غرضی کی شدّت، خود پرستی کی عادت رفتہ رفتہ آدمی کو اس ملکۂ لطیف سے عاری کردیتی ہے۔ بے غرض خدمت، بے لاگ میل جول، اس کو جِلا دیتے ہیں۔ آدمیوں سے سابقے میں، عمل کے متنوع تجربے میں، طرح طرح کی صحبتوں میں، زندگی کی ریل پیل میں یہ ترقی کرتی ہے، خلوت میں اکثر ٹھٹھر جاتی ہے، جلوت میں نکھرتی ہے، تنہائی اسے دباتی ہے، انجمن اسے ابھارتی ہے۔ سیرت کی نشوونما میں اس کا بڑا حصّہ

ہے۔ جو اس سے محروم ہوتے ہیں وہ زندگی میں کچھ اجنبی سے رہتے ہیں اور سیرت کی تعمیر کے ایک اہم عنصر سے کام نہیں لے سکتے۔

سیرت کی تعمیر میں چوتھی چیز جو مدد دیتی ہے وہ طبیعت کی ہیجان پذیری ہے، یعنی یہ کہ نفس مشاہدات و افکار و تصورات سے کتنا اثر لیتا ہے اور اسے کتنی دیر تک قائم رکھتا ہے، ان سے جذبات کی جو لہریں شعور کے دھارے میں اٹھتی ہیں وہ کتنی گہری ہوتی ہیں اور کتنی مدت تک چلتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ پتھر کو کوئی آدمی کیسے بنا دے اور گوبر کا تودہ انسان کے دل کی طرح کیسے دھڑکنے لگے؟ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں آسانی سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا یہاں حرکت پیدا کر دیتا ہے، لیکن اتنی ہی آسانی سے یہ حرکت سکون میں بدل بھی جاتی ہے۔ ان کی سیرت میں یکسوئی پیدا ہونا دشوار بات ہے۔ ان پر ہر رنگ چڑھ جاتا ہے مگر ذرا سی دھوپ میں یہ رنگ اُتر بھی جاتا ہے، یہ ہر تیز رَو کے پیچھے چلتے ہیں مگر بس تھوڑی دور، یہ ہر تحریک کے علم بردار بن جاتے ہیں، مگر بس چند دن کو، بہت جلد عاشق ہو جاتے ہیں، مگر معشوق کو لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں، زندگی میں کئی بار مذہب بدلتے ہیں، آئے دن ایک سیاسی جماعت کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوتے ہیں، سماج کو روز ایک نئے ڈھنگ پر چلانے کے درپے ہوتے ہیں، ہر اشتہاری دوا کو آزمانا چاہتے ہیں! بڑے

دل چسپ ہوتے ہیں یہ نیک دل، بھلے مانس لوگ، مگر سیرت کی یکسوئی انھیں نصیب نہیں ہوتی۔ سیرت پختہ بنتی ہے ان کی جن کے ذہن میں اگر کوئی نیا خیال جگہ پاتا ہے تو گویا ہمیشہ کو اس میں جا بستا ہے، ان کے وجود کے ریشے ریشے میں جاری وساری ہو جاتا ہے۔ پھر تو یہ سب نئے خیالوں کو اس خیال کا تابع کر لیتے، اسی کو سب نئے تجربات و واردات کا محور بناتے ہیں، بحرِ زندگی کی ہر ہوا کو اس بادبان میں بھر کر اپنی سیرت کی کشتی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ خیال ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتا ہے، اور یہ وابستگیٔ فکر وضمیر اگر اقدارِ مطلقہ سے ہو جائے، تو پھر یہ نہایت صداقت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سونا جاگنا، مرنا جینا سب کچھ اسی کے لیے ہے۔ جن طبیعتوں کی ہیجان پذیری میں ایسی گہرائی اور ایسی پائیداری ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے یکسو سیرت میں بدل جاتی ہیں۔

یکسو سیرت کی یہ چار شرطیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا اگر تعلیم کے زمانے میں معلّم کے پیشِ نظر ہوں تو وہ مناسب تدبیروں سے ان کی نشوونما کا سامان کرتا ہے اور انفرادیت کو دبائے یا مٹائے بغیر اس کے عناصر ترکیبی میں نظم پیدا کرنے کی صورت نکالتا ہے۔ لیکن آپ جو اس وقت میرے مخاطب ہیں، جو اپنی رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد اس کالج سے سند لے کر جا رہے ہیں، آپ کے لیے اب یہ معلّم کیا کر سکیں گے؟ اب تو یہ سب کچھ آپ کو خود ہی کرنا ہوگا، اپنی تعلیم و تربیت اب کلیۃً اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی۔

تعلیم میں بیرونی اور اندرونی تشکیل، حکم اور آزادی، دوسرے کی بتائی راہ پر چلنا اور اپنی کاوش سے خود راہ نکالنا اور اسے طے کرنا، ان دونوں کی اعتباری حدود اور تاثیر کا مسئلہ بڑا اہم اور مشکل مسئلہ ہے لیکن عمر کی جس منزل میں آپ داخل ہو رہے ہیں اس میں خارجی تشکیل کا کام تقریباً ختم ہو چکتا ہے اور داخلی تربیت کا زمانہ آجاتا ہے۔ جوں جوں سیرت اخلاقی بنیادوں پر استوار ہوتی جاتی ہے اسی قدر معلّم اور والدین کا کام گھٹتا جاتا ہے اور اپنی تعلیم و تربیت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کا زمانہ آجاتا ہے۔

اس "اپنی تعلیم آپ" کے معنی کیا ہیں؟ کیا بس لفظ ہیں کہ بول دیے یا ان کا کوئی مفہوم بھی ہے؟ بس مطالبہ ہے جو کر دیا یا اسے پورا کرنے کے لیے عمل پیہم کی شرط ہے؟ اپنی تربیت آپ کرنے کے معنی ہیں اپنی روح کو، کہ پست و بلند، ادنیٰ و اعلیٰ، اسفل و ارفع کی آماجگاہ ہے نیچے سے اوپر لے جانے کی سعیٔ مسلسل، پست جبلتوں اور محرکوں، بری عادتوں اور خواہشوں، غلط افکار اور خیالات کے دلدل سے اپنے کو نکال کر اخلاقِ حسنہ کی شاہراہ پر ڈالنا، اپنی انفرادی صلاحیتوں اور میلانوں میں یکسوئی و یک جہتی پیدا کر کے اپنی سیرت کی ساری قوت کو ان اخلاقی معیاروں کا تابع بنانا اور شخصیت اخلاقی کی منزل کی طرف باوجود ناکامیوں اور مایوسیوں کے برابر بڑھے جانا۔ یہ کام در اصل جہادِ زندگی میں ایک سپاہی کا کام ہے، وہ سپاہی جو باطل کی ان قوتوں ہی سے برسرِ پیکار

نہیں ہوتا جو خارج سے زندگی کو بگاڑنا چاہتی ہیں بلکہ باطل کی ان طاقتوں سے بھی جو نفس کے اندر اندر روح کی جڑوں کو گھن کی طرح کھاتی رہتی ہیں، جن کی چھپی ہوئی فوج روح کی مملکت کو تاراج کرتی ہے اور اخلاقِ حسنہ کی بستیوں کو اُجاڑتی رہتی ہے۔ سچا مجاہد ان سے بھی لڑتا ہے، اُن سے بھی۔ یہ جماعت کی زندگی کو بھی اقدارِ عالیہ کا خادم بنانا چاہتا ہے اور اپنی شخصی صلاحیتوں کو بھی۔ اس کا ثباتِ قدم، اس کی خود اعتمادی، اس کا خلوص، اس کا اقدارِ عالیہ پر ایمانِ محکم، اس پیکارِ حیات میں اس کے ہتھیار ہوتے ہیں، اور ضبطِ نفس، بے غرض خدمت اور اخلاقی جرأت اس جہاد میں اس کے رفیقِ راہ ہوتے ہیں۔

زندگی میں ہم جس شخص کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اسے اپنے نفس پر قابو حاصل ہے، اس کی ہم بڑی عزت کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس صفت کی دل سے قدر کرتے ہیں، ہو سکے تو اسے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش بھی کریں مگر بس "طبیعت ادھر نہیں آتی!" اس صفتِ اخلاقی کی تیاری اطاعت کی مشق سے ہوتی ہے۔ پہلے بچے کی اس اطاعت سے جو وہ مجبوراً کرتا ہے، پھر بڑے کی اس اطاعت سے جو وہ سمجھ کر کرتا ہے، ایک کو خارجی اطاعت کہہ سکتے ہیں، دوسری کو داخلی۔ پہلی میں خوف کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے، دوسری میں سمجھ اور عقل کو۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے خوف کا عنصر کم ہوتا جاتا ہے۔ آپ جو اب زندگی کی کشاکش سے بلاواسطہ دوچار ہونے کے لئے کمربستہ ہو رہے ہیں، آپ کہ گھر اور مدرسہ اور کالج کے اثر سے آزاد ہو کر

اپنی تربیت کو آپ سنبھالنے کی منزل میں قدم رکھ چکے ہیں، آپ کو جاننا چاہیے کہ اگر گھر اور مدرسے اور کالج نے آپ میں اطاعتِ داخلی کی بنیادیں استوار نہیں کی ہیں تو آپ کے اس نئے کام کی دشواری ناممکن کی حد تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر آپ کے زادِ راہ میں چند اخلاقی اصول بھی نہیں ہیں جو آپ کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوں، اگر آپ کے اندر احساسِ اقدار ہی پیدا نہیں ہوا ہے، اگر اخلاقی احکام کی پابندی کو آسان بنانے والی عادتیں آپ میں پڑی ہی نہیں ہیں تو یوں سمجھیے کہ آپ تیراکی کی ابتدائی مشق کے بغیر ہی دریا میں کود رہے ہیں، اور دریا بھی طوفانی ہے، قدم قدم پر بھنور ہیں۔ آپ سابقہ تیاری کے بغیر ایک شریر اور منہ زور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ رہے ہیں، نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں! خدا ایسوں کی بھی مدد کرتا ہے اور بسا اوقات یہ بھی ڈوبتے نہیں ساحلِ مُراد پر پہنچ جاتے ہیں اور گر کر چور چور نہیں ہوتے بلکہ منزلِ مقصود پر جا اُترتے ہیں۔ اس کا فضل ہے جس پر ہو جائے۔ کبھی کسی کی ایک نظر، کبھی زندگی کے بے شمار حادثوں میں سے کوئی حادثہ، کوئی شدید وارداتِ قلبی، سابقہ بے توجہی کی تلافی کر دیتے ہیں، آدمی کو کسی اخلاقی اصول کا سہارا مل جاتا ہے اور وہ اب زیادہ توجہ اور زیادہ خلوص سے اس پر چل کر پہلے سے عادتوں کے نہ پڑنے کی کمی کو جیسے تیسے پورا کر لیتا ہے۔ لیکن آپ میں سے بہتوں کو آپ کی تعلیم و تربیت نے کچھ نہ کچھ خیالات اور کچھ نہ کچھ عادتیں تو اس زندگی کے دشوار سفر کے لیے ساتھ دی ہی

ہوں گی۔ ان تصوراتِ اخلاق کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھتے جانا، ان کی حکمت کے علم کے ساتھ ان کی اطاعت کے داخلی میلان کو قوی تر کرتے جانا، یہ اب آپ کا تعلیمی تربیتی کام ہے، جسے خود آپ کو انجام دینا ہے۔ اور اس بصیرتِ اخلاقی کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ آپ میں صداقت ہو، آپ خود تو اپنے سے جھوٹ نہ بولیں، خود اپنے کو تو دھوکا نہ دیں۔ عادتوں کو راسخ کرنے کے لیے ضرورت ہے مشق کی اور مشق کے لیے موقعے کی۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس کا موقع ہے، جو اس سے کام لیتا ہے وہ اپنی عادتیں سنوارتا جاتا ہے۔ آپ کے نفس کے جو دو حصے ہیں، ایک جو حیوان کی حیثیت سے پیدائش سے ساتھ ہے، دوسرا جو انسان کی حیثیت سے ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے، ایک جو طبیعت کا ساتھی ہے دوسرا جو اخلاق کا پابند ہے، ایک جو من مانی زندگی چاہتا ہے، دوسرا جو آزادی سے خود اپنے کو احکامِ اخلاقی میں باندھ کر رکھنا چاہتا ہے، آپ کا سینہ ان دونوں کی کشاکش کا عرصۂ کارزار ہے۔ اس کشاکش میں فتح کس کی ہو، طبیعت کی یا اخلاق کی، حیوانی جبلت کی یا انسانی اقدارِ عالیہ کی؟ دوسرے کی فتح کا سامان کرنا اور برابر کرتے رہنا "آپ اپنی تربیت" کا کام ہے۔

آپ سے زندگی میں جو کام سرزد ہوں گے ان میں سے بعض تو میکانکی محرکات کے ردِ عمل کے طور پر ظاہر ہوں گے۔ ان سے سیرت کی تربیت میں زیادہ مدد نہ ملے گی۔ تربیت کے لیے سوچنے سمجھنے کی ضرورت

ہے، کچھ تامل درکار ہے۔ اس میکانکی ردِ عمل میں اس کا موقع ہی نہیں ہوتا۔ بعض اعمال ان عادتوں سے پیدا ہوں گے جو پچھلی مشق اور تکرار سے پڑ چکی ہیں۔ یہ بھی حقیقی معنوں میں تربیت کا کام انجام نہ دیں گے۔ ہاں، جو اعمال نئے تصورات و افکار سے اخلاقی اقدار اور مطالبات سے پیدا ہوں گے وہ اپنی تربیت آپ کرنے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ نئے افکار و اقدار حکم دیتے ہیں اور حکم جتنا واضح ہوتا ہے تعمیل اتنی ہی سہل ہوتی ہے۔ مگر خالی حکم کی وضاحت کافی نہیں ہوتی، قوتِ ارادی کی مضبوطی بھی درکار ہوتی ہے جو دوسرے پست احکام کو، خواہشوں اور خود غرضیوں کے وساوس کو، نفس امارہ کے فریبوں، لالچوں اور طفل تسلیوں کو کہ ہر اخلاقی حکم اور ہر نیک ارادے کے خلاف فوج در فوج سینۂ انسانی میں ابھرتے ہیں، پسپا کر سکے اور باطل کی یہ فوجیں جب پسپائی کے بعد پھر قلب کے کسی گوشے میں جا چھپیں اور موقع پا کر پھر غفلت میں وار کریں تو ان کو پھر شکست دینا اور دبائے رکھنا اس پر منحصر ہے کہ آپ کے اخلاقی مطالبے سے جو توانائیاں پیدا ہوئی ہیں وہ کس درجے کی ہیں، وقتی ہیں یا پائدار، آپ کی ارادی توجہ اس پر کہاں تک مرتکز رہ سکتی ہے۔ اس دشوار کام میں توجہ کو جمانا سہل ہو جاتا ہے اگر آدمی اپنی صلاحیتوں، اپنی کمزوریوں، اپنی خوبیوں اور برائیوں سے واقف ہو، اپنے کو پہچانتا ہو۔

اور یہ اپنی پہچان کیسے پیدا ہوتی ہے؟ بیٹھے بیٹھے خود بخود

اپنے پر منکشف نہیں ہوتی، نہ کوئی آن کر کان میں یہ راز بتا جاتا ہے۔ اس کا پتا کام کرنے سے چلتا ہے، عمل کے میدان میں کودنے سے چلتا ہے آزادی کے ساتھ صحیح اور غلط دونوں راہوں پر چلنے کا موقع ملنے سے، زمانے کے نرم گرم دونوں چکھنے سے، نیکی کرنے اور بدی کرنے سے، ٹھوکریں کھانے اور ٹھوکر کھا کر سنبھلنے سے، گناہ سے اور توبہ سے چلتا ہے کامیابیوں سے زیادہ ناکامیاں اس کا سراغ دیتی ہیں۔ غلطی کا موقع نہ پاکر صحیح کام کرتے رہنے والوں کو، گناہ کا امکان نہ پاکر معصومیت پر مجبور فخر کرنے والوں کو اس کا پتا نہیں چلتا۔ اس کا رمز شناس تو وہ ہوتا ہے جو معصیت کی ٹھوکر کھاتا ہے، گرتا ہے، مگر گر کر اپنا سر سجدے میں رکھ دیتا ہے۔ اپنے کو پہچاننے کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی آزاد ہو اور اسے تنوع عمل کا موقع ملے۔ لیکن آزادیِ عمل کے بعد بھی اپنی تربیت وہی کر سکتا ہے جس میں صداقت کا جذبہ کار فرما ہو۔ اس کا کہہ دینا سہل ہے، کرنا مشکل۔ آدمی کو شاید کوئی چیز اتنی مرغوب نہیں جتنی اپنے متعلق اچھی باتیں باور کرنا۔ خوشامد کا سارا جادو اسی پر تو بنی ہے، اور دوسرے نہ کریں تو آدمی خود اپنی خوشامد کر لیتا ہے اپنے کو فریب دیتا ہے، اپنے سے جھوٹ بولتا ہے۔ جس پر خود فریبی کا یہ بھوت مسلّط ہو وہ آزاد عمل کی دنیا میں بھی اپنے کو نہیں پہچان پاتا۔ اس لیے ہر شخص کا جو اپنی اخلاقی تربیت آپ کرنا چاہتا ہو نہایت اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اس دشمن سے چوکنا رہے، کہ ذرا آنکھ جھپکی اور اس نے وار کیا۔ اپنے سے پنے

متعلق سچ بولنے کی عادت بڑی قیمتی عادت ہے اور ڈالے سے پڑتی ہے، آپ ہی آپ نہیں پڑ جاتی۔ بہتیرے تو عمل کے میدان میں ایسے منہمک ہو جاتے ہیں کہ اپنے سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ یہ کام میں لگ کر کام کے حسن و قبح سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے شاید یہ خیال کافی ہوتا ہے کہ میرا کام ہے اس لیے اچھا ہی ہو گا۔ جہاں اپنے کام پر دشمن کی سی تنقیدی نظر نہ رہی وہیں سے آدمی کی ترقی بند ہو جاتی ہے۔ اپنے کام پر بےگانہ وار نظر ڈالنے، اپنے ارادے اور نیت و خلوص کو پرکھتے رہنے کی عادت شخصیت کی تربیت کے لیے ازبس ضروری ہے۔ ایسا نہ کرنا غفلت ہے اور شخصیت کی تربیت بیداری چاہتی ہے۔ وساوسِ نفس کے لشکر اسی غفلت میں کامیاب شب خون مارتے ہیں اور ہارنے والے کو معرکے کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اپنے سے یہ بے خبری اچھی نہیں۔

آزاد عمل اور اس پر تنقیدی نظر کے مواقع زندگی کے سب ہی شعبوں میں ملتے ہیں مگر جو اپنی سیرت کی تربیت کے کام کو اہم کام جانتا ہے وہ اپنے لیے بے غرض خدمت کے خاص میدان کا متلاشی رہتا ہے۔ اس میں عمل کے اندر اخلاقی آزادی کا یقین واضح طور پر سامنے رہتا ہے۔ سے دانگبین کی لاگ کے بغیر جو کام ہوتا ہے وہ آزاد اخلاقی مطلبی ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بڑی شخصیتوں کے لیے تو یہ میدان روز بروز وسیع تر ہوتا جاتا ہے، لیکن معمولی حیثیت کے لوگ بھی اپنی سیرت کی تربیت کے لیے کوئی نہ کوئی کام بے لوث خدمت کا منتخب کر سکتے

ہیں۔ بسا اوقات کسی وقتی جذبے سے آدمی ایسے کسی کام کی ذمّے داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس گھڑی کو خوش قسمتی کی گھڑی سمجھنا چاہیے۔ اس کام کو چاہے چھوٹا سا ہی کام ہو برابر انجام دیتے رہنا اپنی تربیت میں بڑی مدد دیتا ہے۔ یہ پہلے چھوٹا سا کام ہوتا ہے، مگر اس پر جمنے سے سیرت میں ایک اعتماد پیدا ہوتا ہے جو اس کے حلقۂ عمل کو وسعت دیتا ہے اور بسا اوقات ایک چھوٹے سے بے غرض کام کی پابندی سیرت میں بڑی پختگی پیدا کر دیتی ہے اور بڑھ کر اور پھیل کر اس کے مختلف پہلوؤں پر چھا جاتی ہے۔ بدنصیب ہیں وہ جو اس کے فیض سے محروم ہیں۔

پہلے بیان کر چکا ہوں کہ سیرت کی تربیت کا کام دراصل ایک جنگ ہے جس میں آدمی بعض قوتوں کا ساتھ دیتا ہے، بعض سے لڑتا ہے۔ یہ کام مجاہدانہ کام ہے۔ اس مجاہد کی خصوصی صفت اس کی اخلاقی جرأت ہوتی ہے۔ جو سیرت بنانا چاہتا ہے اُسے اپنے اندر یہ صفت پیدا کرنی چاہیے۔ اخلاقی جرات آدمی کو اخلاقی اقدار مطلقہ کا سپاہی بناتی ہے، اس میں ایک مستقل عزم پیدا کرتی ہے کہ جب اور جہاں یہ اقدار مطلقہ خطرے میں ہوں، جب ان کے ساتھی بچھڑ جائیں اور دشمنوں کا نرغہ ہو، جہاں رسم یا عادت یا تن آسانی ان کی ظاہری اطاعت کو بھی بس ایک بے حقیقت ڈھونگ سا بنا دیں تو یہ انھیں زندہ کرنے، انھیں زندہ رکھنے میں اپنی ساری قوت صرف کر دے۔ جہاں

اور جب کبھی، جی ہاں، جہاں اور جب کبھی۔ ہماری تاریخ ایسی اخلاقی جرأت کی مثالوں سے بھری پڑی ہے، ہر شریف قوم کی تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، ایسا نہ ہو تو قوم کو شرافت کا تمغۂ امتیاز ہی کیسے حاصل ہو؟ ہر وہ نوجوان جو اپنی قوم کے لیے یہ تمغہ حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے اپنے اندر یہ مجاہدانہ صفت پیدا کرنے کے لیے بے قرار ہونا چاہیے اور اسے پیدا کرنے کے لیے اس کی نشانیاں معلوم ہونی چاہئیں۔ اسے جاننا چاہیے کہ اس کی ایک نشانی تو وہ شجاعت ہے جو اپنی آسایش اور زحمت، سود و زیاں، اور دوسروں کی واہ وا یا لعن طعن کا میزانیہ بنائے بغیر اس معرکے میں ثبات قدم عطا کرتی ہے، دوسری نشانی اس قدرِ اخلاقی کا پورا یقین ہے جس کے لیے آدمی سینہ سپر ہو رہا ہے، اور تیسری نشانی یہ ہے کہ اس قدر کی حفاظت اور حمایت میں اسے اپنی ذمے داری کا پورا احساس ہے۔ سمجھ بوجھ ذمے داری اور استقلال دیا رری کے ساتھ اس کے لیے جان تک کھپانے کی آمادگی ہو تو جرأتِ اخلاقی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں نہ غرور کو دخل ہوتا ہے، نہ جذبات سے مغلوبیت کو، یہ کھلی آنکھوں دہکتی آگ میں کودتی ہے اور مسکراتی ہوئی سولی پر چڑھتی ہے۔ یہ کسی وقتی جوش و خروش کے ریلے میں میدان میں نہیں اُترتی، بلکہ عرصے تک انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزارنا بھی جانتی ہے۔ یہ ہم خیالوں کے مجمعوں میں بڑھ بڑھ کر باتیں نہیں بناتی، نہ تالیوں اور نعروں اور جے کاروں کی ٹھکاری پر چہچہاتی

ہے، یہ ایک لفظ بھی کہتی ہے تو اُس کی ذمّے داری کا پورا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس کرتی ہے، یہ بھڑکتی ہی نہیں، سُلگتی بھی ہے، اس کی نشانی ہی ہے سمجھی بوجھی ذمّے داری اور اس کے پورا کرنے کے لیے سعیِ پیہم۔ اس سے سیرت اقدارِ عالیہ کی چاکر بن جاتی ہے اور جو سیرت اپنے کو شعوری طور پر اقدارِ مطلقہ کا خادم بنائے وہ شخصیت بن جاتی ہے شخصیت کائنات کی شاید سب سے گراں بہا متاع ہے۔ اس پر فرشتے رشک کر سکتے ہیں اور خالقِ کائنات اپنے شاہکار پر ناز کر سکتا ہے۔

میرا پیام آپ کو یہی ہے کہ اپنی سیرت کی تربیت کو اب اپنے ہاتھ میں لیجیے، ضبطِ نفس اور بے غرض خدمت سے اس کے عناصر کی پرورش کیجیے، اچھی سیرت بنائیے اور اسے اقدارِ عالیہ مطلقہ کا خادم بنا کر شخصیت اخلاقی، یعنی بندۂ مومن اور مردِ مجاہد کے مرتبۂ بلند پر پہنچائیے۔ کام بڑا دشوار ہے اور عمر بھر کا کام ہے، مگر اسی کام کے کرنے کے لیے ہی تو زندگی عطا ہوئی ہے، یہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے کیسے انجام پائے گا، اس میں تو زندگی ہی کھپانی چاہیے۔

جو جان دے کے پائیں تو فوزِ عظیم ہو
وہ چیز مانگتے ہیں تن آسانیوں میں ہم

تن آسانی چھوڑیے اور اس کام میں لگ جائیے۔

خدا حافظ!

جامعہ کے پچیس ۲۵ سال

(یہ روداد جامعہ کے جشنِ سیمیں کے خاص جلسے میں جو ۷ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو زیرِ صدارت اعلیٰ حضرت جناب نواب صاحب بھوپال منعقد ہوا، پڑھی گئی)

اعلیٰ حضرت، محترم امیر جامعہ، خواتین اور حضرات!

آج مجھے آپ کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پچیس سالہ روداد کا خلاصہ پیش کرنا ہے، پچیس سال اور کیسے پچیس سال! یہ کام جب شروع ہوا تھا تو کتنے تھے جن کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس پر پچیس سال بھی گزر جائیں گے؟ خاصی طویل مدت ہوتی ہے پچیس سال کی، اور پھر قوموں کی زندگی میں یہی پچیس سال ایک لمحے سے بھی کم ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اپنی طوالت کے یہ زمانہ بے رنگ مرور کا مرادف بھی ہو سکتا ہے، اور حیاتِ قومی کا یہی ایک لمحہ ایک تخلیقی لمحہ ہونے کی وجہ سے صدیوں پر بھاری بھی ہو سکتا ہے۔ ان گزرے ہوئے پچیس سال کی روداد کس اسلوب سے پیش کروں؟ اس مدت میں عزائم اور فسخِ عزائم، ولولوں اور پژمردگیوں، مشقتوں اور سہل انکاریوں، دل بستگیوں اور دل شکستگیوں، شبہوں اور

اعتمادوں، امیدوں اور مایوسیوں، تھپکیوں اور گھڑکیوں، حوصلہ مندیوں اور درماندگیوں کی کیسی کیسی مثالیں سامنے آئی ہیں؟ اور یہ سب لفظ جو میں نے بولے یہ صرف برائے گفتن نہیں، ان میں سب کی مثالیں اس وقت میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اس روئداد میں اُن کا ذکر کروں تو داستان بہت طویل ہو جائے گی، خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر خدمتِ قومی کا کوئی کام نیک نیتی سے، خدا کا کام سمجھ کر کیا جائے تو ہر چند کہ دشواریوں اور آزمائشوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن جس کا کام ہوتا ہے وہ دست گیری فرماتا ہے، متزلزل قدموں کو ثبات عطا ہوتا ہے، دل توڑا بھی جاتا ہے مگر پھر جوڑا بھی جاتا ہے۔

دلِ شکستہ وراں کوئے می کنند درست
چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسراً، اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسراً۔ شرط یہ ہے کہ عُسر کو اس کی رضا جوئی میں جھیلا جائے اور یُسر کو اُس کی راہ میں پیش قدمی کے لیے سہولت اور مرحمت جانا جائے۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کردوں، آپ سب کو یاد ہوگا، اس لیے کہ باوجود حافظے کی معروف ناپائیداری کے وہ آسانی سے بھلا سکنے کی بات نہیں کہ کوئی دس سال کی انتہائی ہیجانی اور تلاطمی بے چینی کے بعد ۱۹۲۰ء میں مسلمانانِ ہند کی ایک عمومی حرکت نے تحریکِ خلافت کی شکل اختیار کی۔ ساری دنیا میں ملّتِ اسلامی پر جو گزر رہی تھی اُس سے

ہندستان کے مسلمان بے خبر اور غیر متاثر نہ تھے، اپنی جماعتی حالت کی زبونی سے بھی باوجود صد غفلت، یہ آنکھیں بند نہ کر سکتے تھے، مایوسی بھی تھی، غصہ بھی تھا، اور بے ہاتھ پاؤں مارے اپنے خاتمے کا خیر مقدم کرنے کو بھی تیار نہ تھے۔ کہ جسم جماعتی میں ابھی کہیں زندگی کی رمق باقی تھی، اور جس طرح کسی شدید مرض کے حملے میں جسم اپنی ساری قوتوں کو سمیٹ کر ایک بار دفعِ مرض کی جان توڑ کوشش کرتا ہے اسی طرح ملتِ اسلامیۂ ہندیہ نے اپنی ساری ناتواں توانائیوں کو مجتمع کرکے صورتِ حال کے مقابلے کا تہیّہ کیا تھا۔ جس طرح جسم کے سارے نظام ہائے اعضا اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اُس کی اس مصیبت میں آخری معرکے کے لیے کمربستہ ہوکر، کتابوں اور حکیموں کے اندازوں سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں، اسی طرح جسمِ اجتماعی کا حال ہوتا ہے۔ اس تلاطم کے زمانے میں مسلمانانِ ہند نے اس قسم کی ایک کوشش کی تھی، تعلیمی نظامِ اعضا کے فعل کا نتیجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔

تعلیم کے کام کا پُرسکون، دھیما پن اور ایک انقلاب انگیز سعیٔ ملّی کی ہنگامہ آرائی کا یہ تعلق بادی النظر میں کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس دورِ انقلاب میں جامعہ کے نام سے ان تمام نیم شعوری اور تحت شعور تعلیمی منصوبوں نے ایک شکل اختیار کی جو ایک عرصے سے مسلمانوں کے اہلِ فکر و عمل کو ایک صحیح قومی تعلیمی نظام

کے ترتیب دینے پر اکسا رہے تھے۔ اس میں محمد قاسم کی تمناؤں، سیّد احمد خاں کی آرزوؤں، سیّد محمود کی تجویزوں، وقارالملک کے ارادوں اعلیٰ حضرت کی سلطانیہ کالج جیسی اسکیموں، غرض خدمت اور احیائے ملّت کی بہت سی چھوٹی بڑی کوششوں کا پرتو ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم اپنے وجود کے وظیفۂ بنیادی سے غافل نہیں ہے، اور جب بھی اپنی زندگی کے باقی رکھنے اور ترقی دینے کی طرف متوجّہ ہوتی ہے تو اسے تعلیم، صحیح تعلیم ہی کی راہ پر گامزن ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہماری قومی زندگی کا شیرازہ جو خود ہمارے ہاتھوں بہت بوسیدہ ہو چکا تھا، بکھرا تو ہم نے دیوبند اور علی گڑھ میں اسے پھر سے جوڑنے کی سعی شروع کی۔ اس صدی کے ربع اوّل میں مسلمان جس عالم گیر ابتلا میں رہے اس میں انھوں نے جامعہ ملّیہ قایم کی۔ یہ قوم میں صحیح زندگی کے ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن بس رمقِ زندگی کا۔ یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جب صحت کا کچھ شائبہ بھی جسم جماعتی میں ہو تو وہ اپنے ہیجانات کا اظہار ہسٹریا جیسے تشنجی ہنگاموں میں نہیں کرتی بلکہ اس بحرانی قوت کو دھیمے دھیمے مگر منزلِ مقصود کی طرف یقینی طور پر چلنے والے ارادوں کا خزینۂ توانائی بنا دیتی ہے۔ یہ سبق ہے ہماری قوم کو کہ وہ اپنے جوش و خروش کو گھنٹوں اور دنوں کے اندر خالی نعروں اور جلسوں میں منتشر نہ کر دے بلکہ صبر طلب و صبر آزما تعمیری مساعی میں اسے برسوں، قرنوں بلکہ صدیوں پر پھیلانا سیکھے۔ میں نے کہا کہ یہ

جامعہ ثبوت ہے اور سبق ۔ البتہ بہت ہی کم زور سا ثبوت اور بہت ہی روکھا پھیکا سبق ۔ کیا عجب ہے کہ تائیدِ ایزدی ہو تو کام کرنے والوں کی استقامت اور قوم کی پذیرائی اس ثبوت کو بہت قوی اور اس سبق کو بہت دل نشین بنا دے ۔

ہاں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اس جامعہ میں احیائے ملّی کی بہت سی تعلیمی تجویزوں کا سنگم ہے ۔ اسی حقیقت کا اظہار تھا ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم و مغفور کے ہاتھوں سید احمد خاں کے دارالعلوم کی مسجد جامع میں اس کام کا افتتاح ۔ عجب زمانہ تھا وہ ، صاحبو ۔ نشۂ جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے ۔ یہ جرمانوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے راتوں کو روتے اور گڑگڑاتے سُنائی دیتے تھے ، خود غرضیوں کی ہر وقت جکڑے رہنے والی زنجیریں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں ، ٹوٹ رہی ہیں ۔ ملازمتوں کے متلاشی ، سفارشوں کے لیے سرگرداں ، اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بے تاب تھے کہ اپنے وجود کو وجودِ ملّی میں گم کر دیں ، اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں ۔ لیکن عمر بھر خود غرضی کی تکرار سے بے غرض کاموں کی مشق تو نہیں ہوتی ، اس بے غرضی کا رُخ بھی جاذبِ توجہ ہنگاموں کی طرف ، گلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے

ہونے کی طرف، تقریروں کی طرف نئی نئی وضع کے لباسوں کی طرف ہی جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سر برآوردہ لوگوں نے اُس وقت اس جوش اور خلوص کو ایک پائے دار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے، اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی، جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجودِ مقدس، قید، جلاوطنی، علالت اور تفکراتِ ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلادی تھیں، جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی پنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کردیا ہے، لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کررہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے، لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مددِ خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا ہے، ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کرسکتا اور اس کا پیام اس کے شاگردِ رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو، یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمانِ محکم اور اس ایمان کے نتیجے یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی عمارت کا افتتاح نہ ہوسکتا تھا۔ چندوں کا اعلان

بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سر و سامان چھوڑ کر بے سر و سامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا، یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی، وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیرِ نو کے لیے نکلا تھا اور اُس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔

اس کام کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے وابستہ رہے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم اس کے پہلے امیر جامعہ مقرر ہوئے، اور مولانا محمد علی مرحوم پہلے شیخ الجامعہ۔ حکیم صاحب مرحوم نے ہم نوجوانوں کو متانت، رواداری، خاموش خدمت کا سبق دیا۔ حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں، اور ان کی نظر حال کی ترقیوں اور مستقبل کے امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دیکھ سکتا ہو۔ ہم نے ان سے قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور سمونے کا سبق سیکھا۔ حکیم صاحب اپنے دلی کرب کو اپنے دل فریب تبسّم کے پردے میں یوں چھپانا جانتے تھے جیسے صرف ایک ہم آہنگ شخصیت جانتی ہے، تکلیف میں مسکراتے رہنے کی عادت بھی ہم نے ان سے سیکھی۔

پھر مولانا محمد علی اس عہد کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں تھے جنھیں قدرت نے ذہنی قوتوں کے ساتھ قلب و روح کی بے تابی بھی ارزانی فرماتی

ہے، ان کا ذہن انھیں فرزانوں کا فرزانہ اور ان کا دل انھیں دیوانوں کا دیوانہ بنا دیتا ہے۔ جامعہ کے ابتدائی کام کرنے والوں کو اس دیوانۂ فرزانہ کی شاگردی اور ہم رکابی کا شرف بھی حاصل ہوا جس نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم برہم کر دیں۔ جامعہ والوں کو ان سے وہ گرمیِ قلب ملی جو مایوسیوں میں اُمیدوار، اور تہی دستی میں غنی رکھ سکتی ہے، اور اگرچہ بے وسیلگی میں ہمارے منصوبوں کی آہٹ پاکر بسا اوقات نیک دل ہمدردوں نے ہم پر ترس کھایا اور زبانِ حال سے فرمایا :-

به سادگیٔ تو رحم آمدم درایں بازار
که تنگ دستی و امیدوار می گزری

لیکن محمدؐ علی کی تربیت نے ہمیں دلِ شکستہ و ویراں کی قدر کرنا سکھا دیا تھا، اور ہم بھی عرؔفی ہی کے الفاظ میں اپنے نیک دل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ :-

عرؔفی دلِ آباد بہ یک جو نہ خرد عشق
من ہم دلِ ویراں بہ دو عالم نہ فروشم

لیکن مولانا محمدؐ علی زیادہ دن جامعہ میں نہ رہ سکے تھے کہ سیاست نے انھیں پھر طلب کیا، اور ہمارے ملک میں تو سیاست کا انعام اکثر قید و بند اور دار و رسن کی شکل میں ہی ملتا رہا ہے۔ کراچی کے مشہور مقدمے کے بعد مولانا قید کر لیے گئے، اور ہمارے کام کی باگ عبدالمجید خواجہ صاحب نے

سنبھالی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ خواجہ صاحب امیر جامعہ کی حیثیت سے آج ہم میں موجود ہیں، اور میں جامعہ کے تمام کارکنوں کی طرف سے اُن کی خدمت میں مبارک باد کے ساتھ ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ اُن کی رہنمائی نے جامعہ کو اس ڈھنگ پر جما دیا جس پر وہ آج تک چلتی رہی ہے۔ خواجہ صاحب نے جامعہ کے خالص تعلیمی مشن کو سب سیاسی کام کرنے والوں سے منوایا، اور جامعہ نے تہیّہ کیا کہ وہ تعلیمی کام کو تعلیمی کام کی حیثیت سے کرے گی، اور اس میں تعلیمی آزادی کو بطور اصولِ بنیادی کے ہمیشہ پیشِ نظر رکھے گی۔ اس دور کی سب سے اہم بات یہی ہے کہ جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول، سیاست کی دھوپ چھاؤں سے بے تعلقی، آنی اور وقتی منصوبوں اور پائیدار اور دیر طلب کاموں میں مؤخرالذکر کی اہمیت کا اقرار یہ ہمیشہ کے لیے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہو گئے۔ اور اگرچہ بسا اوقات اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، لیکن یکسوئی سے اس پر قایم رہ کر ہم نے نکتہ چینوں کو بھی، اُن کی نکتہ چینی کا قیمتی حق چھینے بغیر، مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے، آناً فاناً چڑھتا ہے اور

دیکھتے دیکھتے اُتر جاتا ہے، تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ سیاست استحکامِ وجودِ قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بے تاب، تعلیم اقدارِ مطلقہ کی عاشق ہے، لازماً صبر طلب، تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی اور پیدا کرتی ہے، سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت، اس لیے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں، تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لیے نہیں ہے، راہ رو کا رُخ متعین کرتی ہے:

ملالِ عالمیاں دم بدم دگرگون است
منم کہ مدتِ عمرم بیک ملال گزشت

بہرحال جامعہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں تعلیم کو تمام غیر تعلیمی خارجی اثرات سے جو تعلیمی آزادی میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دور میں کہ شاید تنگ دستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو، اور رُک رُک کر آگے بڑھنے کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے، جامعہ کے کارکن اس اصول کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔

غرض قومی زندگی میں تعلیم کی مرکزی حیثیت اور اس اہم وظیفے کو

کما حقہٗ ادا کرنے کے لیے آزادی کی ضرورت، ہم پر آغاز کار ہی میں روشن ہو گئی تھی۔ اس وظیفے کو ادا کرنے اور اس آزادی کو خالی منفی نہیں بلکہ عمل کی مثبت آزادی میں منتقل کرنے کا کام بڑا دشوار تھا۔ اس دشواری میں اور بھی اضافہ ہو گیا جب بعض مجبوریوں کے باعث خواجہ صاحب شیخ الجامعہ کے عہدے سے سبک دوش ہو گئے، اور پھر کچھ عرصے بعد حکیم اجمل خاں صاحب کا سایہ ہمارے سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعے کا ذکر مناسب ہو گا، اس سے جامعہ کے کام کی روح اور اس کے اسلوب کار پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے، ان کی محبت اور شفقت، ان کی فراخ دلی اور انسانی ہمدردی، ان کی بُرائی سے بےزاری اور نیکی کی ہر رنگ میں اعانت کا جذبہ، ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے اور ہم شکرگزاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمعیت خلافت اٹھاتی تھی۔ لیکن سیاسی دریا کے اُتار نے اس صورت کو ممکن نہ رکھا، حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش سے جامعہ کے کام کے لیے وسائل فراہم کرتے تھے۔ آخری زمانے میں مسلسل علالت اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث ماہ بہ ماہ فراہمی زر کے کام میں خلل پڑتا رہا،

اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصا قرض تھا۔ ہم کارکنوں کو، حتیٰ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کو یہ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے ہمارے لیے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے خود ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مشورے سے ان کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ کے کام کو جاری رکھنے کا قصد ہو تو فراہمی زر کی طرف امنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اس کے بند کرنے کا فیصلہ کریں تو مجھے اس فیصلے کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرما دیں تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی مدد سے میں اس ادارے کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی قائم رکھ سکوں تو اس کی کوشش کروں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ امنا کی خدمت میں بھیجا اور انھیں فیصلے کی فوری ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا۔ زمانہ بہت برا تھا، سیاسی ردِ عمل نے ساری امنگیں دبا دی تھیں، ایک عام انتشار کی حالت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لیے جسے حکومتِ وقت بھی تسلیم نہ کرتی ہو، جو اپنی بے سرو سامانی کے باعث خود بھی ظاہر بین نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے، کون روپیہ دینے پر تیار نظر آتا، چناں چہ ہمارے امنا کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھے کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیے، روپیہ فراہم نہیں کیا جا سکتا اور بہت سوں نے کہ شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے

ہمدرد اور خیر خواہ تھے یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصے کو زندہ رکھنے کا خیال قابلِ تعریف تو ہے مگر قابلِ عمل نہیں، اس خیال کو چھوڑو، کوئی اور مفید کام کرو۔ اس فیصلے اور اس مشورے میں تجربہ، زمانہ شناسی، مصلحت اور احتیاط کتنی بھی ہو یقین اور جرأت کی کمی ضرور تھی۔ لیکن یہ چیزیں الحمدللہ کہ، قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ میں نے اس خط کے ساتھ جس کا ذکر کیا، ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کیا کرتے تھے۔ انھیں بتایا تھا کہ غالباً امنا کا فیصلہ یہی ہوگا کہ جامعہ کو بند کر دو، کیا آپ ہم مل کر اس کے کسی حصے کو بچائیں؟ روپیہ نہیں ہے، قرض ہے، جلد روپیہ ملنے کی کوئی توقع بھی بہ ظاہر نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں، بچوں کو بلا کر کم سے کم سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت بے جا ہوگا، کہیے کیا رائے ہے؟ ان کا جواب آیا ـــــ سب کا، بلا استثنا سب کا، کہ کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، روپیہ نہ ہوگا بلا معاوضہ کام کریں گے، ایک دوسرے کو سہارا دیں گے، لیکن ایک بار کوشش کر کے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لیے ضرور تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا، لہٰذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمت کا امتحان خوب خوب ہوا، مہینوں کسی کو ایک پیسہ معاوضے کا نہ دیا جا سکا، لیکن ہم نے جامعہ کے انتظام میں ایک بنیادی تبدیلی کرلی۔ سب وہ جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ ہو گئے، سب وہ جن کے

دل کو لگی تھی اس کام کے ذمے دار بن گئے۔ ایک انجمن، انجمن تعلیم ملی کے نام سے قایم کی گئی، جس میں چند بنیادی امنا کے علاوہ جو ہمارے شریک رہنے پر آمادہ تھے، ۱۱ ساتھیوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا، اس شرط پر کہ وہ بیس سال تک، یا تاحیات، اگر زندگی بیس سال سے پہلے ختم ہو جائے، جامعہ کی خدمت کریں گے، اور اپنی خدمت کا صلہ کبھی ۱۵۰ روپے سے زیادہ طلب نہ کریں گے۔ حالات نے آج تک کسی حیاتی رکن کو یہ معاوضہ بھی نہیں لینے دیا ہے۔ اب اس انجمن میں ۲۴ اراکین ہیں اور ہمارے دوسرے ساتھی جو ابھی رکن نہیں ہیں وہ بھی اراکین ہی کی سی پابندیوں کے ساتھ جامعہ کے کام کو ایک اچھا عبادت کا کام سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ بہت مشکل تھا اس انجمن کا ابتدائی زمانہ مگر ہمارے محترم مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہمراہ مدراس کا دورہ فرمایا اور ان کے اثر اور سیٹھ جمال محمد کی فیاضی سے وہ سخت وقت بھی گزر گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس انجمن کا قیام ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک قابلِ توجہ واقعہ ہے۔ اس نے اس زر پرستی کے زمانے میں تعلیمی، تہذیبی، دینی کام کو نیک کام کی حیثیت سے کرنے کی طرح ڈالی ہے اور اسے ایسا کام بنانا چاہا ہے جس کا اصلی انعام خود کام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ماضی کی ساری شاندار روایات اسی طرزِ عمل کی رہینِ منت ہیں، ہمارے مستقبل کے لیے اس نئے طرزِ خدمت کا رواج ایک

فالِ نیک ہے۔

دوسرے اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لیے ایک نئی راہ نکلی ہے۔ تعلیمی آزادی کا وہ خیال جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے، اس انجمن کے قیام سے اور واضح ہو گیا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہو، سیاسی جماعتوں کے اثر سے آزاد ہو، بلکہ ناواقف شخصیتوں اور غیر تعلیمی رجحانات رکھنے والی ٹولیوں کے اثر سے بھی پاک ہو۔ غیر سرکاری مدارس کی انتظامی جماعتوں اور اس کے ملازموں، یعنی واقعی تعلیمی کام کرنے والوں، کی روز کی کشاکش وکیلوں اور تاجروں اور عہدے داروں کے انمل بے جوڑ مجموعوں کو جو استادوں کو خریدتے ہیں اور زر خرید چیز کی طرح برتتے ہیں اور ان استادوں کو جو اپنے کو جنس بازاری کی طرح سمجھتے ہیں، تعلیم گاہوں میں یک جا کر کے صحیح تہذیبی تعلیمی مرکز کیسے بن سکتے ہیں؟ تعلیم کا کام صرف انھیں کرنا چاہیے جو اسے اپنا حقیقی کام سمجھتے ہوں، جو اس کے بغیر بے چین رہیں، جو اس کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھیں اور جو اس کام کی اہمیت اور اپنی اس کے ساتھ وابستگی کے باعث خود اپنا احترام کرتے ہوں کہ اپنے کام کو اپنی بصیرت کے مطابق بہترین طریق پر انجام دیں۔ میرا خیال ہے کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں میں اس قسم کی پہلی انجمن ہے، اور میری دعا ہے کہ ایسی متعدد انجمنیں جلد وجود میں آئیں اور ہماری تعلیم کا کام کرائے کے کام کی جگہ

عبادت کی ایک شکل بن جائے۔

آزادی اور مختاری کی یہ تدریجی نشو و نما بے حقیقت ہوتی اگر اپنے مالی وسائل کی فراہمی میں جامعہ اس کے مناسب حال طریقۂ کار اختیار نہ کرتی چناں چہ جامعہ نے یہ کیا۔ ہماری جدید تعلیم گاہیں معمولاً سرکاری گرانٹ اور امرا کی امداد سے چلتی ہیں، اور اس طرح کہ ان کا وجود انھیں پر منحصر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی تعلیمی جماعت اپنے کام کے شرف کا احساس رکھ کر آزادی کی خواہش بھی رکھتی ہو تو وہ آزادی خالی دکھاوے کی آزادی ہو سکتی ہے۔ جامعہ کا کام جب سے اس کے واقعی کام کرنے والوں نے انجمن جامعہ ملّیہ کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے مالی وسائل کی فراہمی کا بھی ایک نیا ڈھنگ ڈالا ہے۔ سرکاری امداد کا تو سوال ہی نہ تھا، متمول طبقے کی مدد کم یاب تھی، اہلِ ثروت سرکاری بے اعتنائی بلکہ مخالفت کی صورت میں ایک تعلیم گاہ کو جس کے کام نے بھی ابھی اپنی ساکھ پیدا نہ کی تھی کیسے اپناتے؟ اور ہم کہ اپنی آزادی کی قدر شروع سے کرنا چاہ رہے تھے اپنے وجود اور اپنے طرز کار کو کیسے اس قسم کی مدد پر منحصر کرنے پر راضی ہو جاتے؟ ہم نے چند خواص کی جگہ جمہورِ ملت کو اپنا مددگار بنانا چاہا اور ۳۲ء میں ہمدردانِ جامعہ کے نام سے ایک طبقے کی تنظیم شروع کی، جس میں ہوتے ہوتے دس ہزار ہمدرد ہو گئے ہیں، جو ہمیں ماہانہ یا سالانہ چھوٹی چھوٹی رقمیں مرحمت فرماتے ہیں، لیکن ایک بار نہیں بلکہ برابر

مرحمت فرماتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے کام سے ناخوش ہوتے ہیں تو اپنی مدد بند کر دیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو اور دوسرے دوستوں کو بھی اس حلقے میں شامل کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق دو چار صاحبانِ ثروت سے نہیں بلکہ ہزاروں ہمدردوں سے بندھا رہتا ہے اور ہمیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کسی ایک آدمی کے ناخوش ہونے سے ہمارا کام رُک جائے گا، بلکہ ہماری مدد صرف اس وقت بند ہوگی جب ہم اتنے بُرے ہوں کہ جمہور امت ہم سے متفقہ طور پر ناخوش ہو جائیں۔ اس وقت بے شک یہ مدد بند ہو بھی جانی چاہیے اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کیوں اپنے ہمدردوں کی ہمدردی قایم نہ رکھ سکے۔

۱۹۳۲ء میں اس حلقے سے ۵ ہزار روپے جمع ہوئے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں اس نے ۲۴ ہزار فراہم کیے، ۱۹۴۲ء میں ۳۲ ہزار، ۱۹۴۴ء ۱۹۴۵ء میں ۴۱ ہزار اور ۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء میں جوبلی کے خاص چندے کے علاوہ جو اسی حلقے کی معرفت جمع کیا گیا ہے، اور جس میں اس نے اب تک ۲ لاکھ ۳۸ ہزار روپیہ فراہم کیا ہے، اپنے معمول کے طور پر ۴۸ ہزار روپئے جمع کیے۔ اس عمومی امداد سے ہمیں پتا چلتا رہتا ہے کہ ہماری قوم ہمارے کام کے متعلق کیا سمجھتی ہے؟ پچھلے تیرہ سال کا اندازہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا، اس حلقے نے ۵ ہزار سے بڑھا کر ہماری گرانٹ ۴۸ ہزار روپئے کر دی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ زمانہ کیسے ہیجان کا زمانہ رہا ہے؟ اس میں لوگ ہم سے ناخوش بھی ہوئے

ہیں، ہم پر نکتہ چینی بھی ہوئی ہے، ہم نے صحیح تنقید سے سبق لیا ہے، غلط کو صبر سے سُنا اور سہا ہے اور قوم نے ہمیں اس سال میں اڑتالیس ہزار چھوٹے چھوٹے چندوں کی شکل میں عطا فرمائے ہیں۔

پھر قوم کے عوام کے ساتھ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اہلِ ثروت کا اعتماد حاصل ہوا، اعلیٰ حضرت حضور نظام نے، اعلیٰ حضرت فرماں روائے بھوپال نے، اعلیٰ حضرت نواب صاحب رام پور نے، ریاست کشمیر نے، پھر دہلی میونسپلٹی نے ہمارے کام کے لیے مستقل امدادیں عطا فرمائیں اور وہ کام جو رُک رُک کر ہوتا، گر گر ہوتا، ذرا آسانی سے انجام پاسکا۔

قوم کی مدد سے، اس کے متوسطین اور امرا دونوں کی مدد سے یہ کام رفتہ رفتہ بڑھا۔ جامعہ کے پاس جس نے پچیس سال پہلے بغیر ایک چپہ زمین کے، اور بغیر عمارت کی ایک اینٹ کے، اور بغیر سرمائے کے ایک پیسے کے، کام شروع کیا تھا، آج اوسط قیمتوں کے لحاظ سے ۱۵ لاکھ سے اوپر کا اثاثہ ہے۔ موجودہ قیمتوں میں تقریباً ۳۰۔۲۵ لاکھ کا۔ اس کے کام کو تعلیمی حلقوں میں، اس ملک میں، اور اس ملک کے باہر بھی کچھ نہ کچھ پسند کیا گیا ہے اس کی مثال نے اور اس کے کام کرنے والوں کے اثر نے قوم میں تعلیمی کاموں کے اصولوں کو کم سے کم فکری طور پر ضرور متاثر کیا ہے۔ اس کی مقبولیت بڑھی ہے۔ اس سال اس کے مدرسہ ابتدائی میں ایک ہزار سے اوپر داخلے کی درخواستوں میں سے صرف چالیس بچوں کی درخواستیں منظور کی جاسکی ہیں۔ جو ہم پر شبہہ کرتے

تھے، اور ہمارے تعلیمی کام کو اور کاموں کے لیے بس ایک آڑ سمجھتے تھے وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ حکومت ہند نے دو سال ہوئے ایک بڑی مستند کمیٹی سے ہمارا کام دکھوایا اور اس کمیٹی نے ہمارے تمام امتحانوں کے سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے کی سفارش کی، چناں چہ ہمارا جامعہ جونیر کا امتحان سرکاری طور پر مسلمہ میٹرک یا اسکول فائنل کے مساوی تسلیم کر لیا گیا اور ہمارے استادوں کے مدرسے کے صداقت نامے کو بنیادی مدرسوں کی معلمی کے لیے مستند مانا گیا۔ حکومت ہند نے اپنے ساٹھ منتخب اساتذہ کو ہمارے استادوں کے مدرسے میں تربیت کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

آج جامعہ ایک چھوٹا سا اقامتی کالج چلا رہی ہے، جس کے متعدد فارغ جامعہ کے کام میں اپنی ساری قوتیں وقف کر رہے ہیں اور ملک کے مختلف گوشوں میں، علمی، تعلیمی، صحافتی تجارتی، سیاسی کاموں میں نیک نامی کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا، کوئی پچیس ہزار مجلدات پر مشتمل کتب خانہ جمع کر لیا ہے، ایک اقامتی مدرسۂ ثانوی، ایک اقامتی مدرسہ ابتدائی چلا رہی ہے، جن میں جدید طریق ہائے تعلیم پر تجربے کیے جا رہے ہیں، اور انھیں اپنی قومی ضرورتوں کے لیے مفید بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، ایک ادارہ تعلیمی مرکز کے نام سے شہر دہلی میں چل رہا ہے، جو ایک مڈل اسکول، ایک عمومی دارالمطالعہ، عام اجتماعات کے لیے ایک ہال، پڑوس کے شہریوں

کے لیے ایک کلب پر مشتمل ہے اور اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے۔ تعلیم بالغان کے طریقوں پر تجربہ حاصل کرنے کے لیے ادارہ تعلیم و ترقی کے زیر اہتمام ایک تجربی مرکز قایم ہے، اور دوسرے کام کرنے والوں کے لیے طریق کار سے متعلق لٹریچر شایع کرنے کے علاوہ اس نے بالغ مبتدیوں کے لیے ڈیڑھ سو سے اوپر رسالے شائع کیے ہیں۔ ایک استادوں کا مدرسہ ہے جس میں بنیادی مدرسوں کے استادوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔ اردو میں اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر مکتبہ جامعہ انجام دے رہا ہے، اور آج اردو کے خادموں کی صف اوّل میں اپنے لیے ایک اچھی جگہ پیدا کر چکا ہے، ایک چھوٹا سا شعبہ مصنوعات جامعہ کے مدرسہ ثانوی کے معمل سائنس سے متعلق ہے، اور روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں تیار کرتا ہے، ان مختلف اداروں کے کچھ کام کا اندازہ آپ کو جوبلی کی نمایش کے ملاحظے سے ہو سکے گا۔

غرض خاصا پھیلا ہوا کام ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں لیکن سب چھوٹا چھوٹا کام ہے، ابتدائی حالت میں ہے، ہر پہلو سے اصلاح و ترقی کا پیاسا ہے، اور بلا کسی بے جا انکسار کے نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کاموں کی تفصیل بیان کرنے میں فخر کا شائبہ بھی نہیں کہ شرم سے آنکھیں اٹھانے کا بھی یارا نہیں: پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ! پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب!! جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں،

جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں ہر پختہ کام کی طرح سست رفتاری ہے، جانتا ہوں کہ تعلیمی، تربیتی کام میں ہتیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارتے میں پھیل جائے، اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے، چمن بندی ہے، مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے، دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے، اور ہاں، خونِ جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی، پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خونِ جگر کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایاں ہوتے تو کیا یہ جلد بازی ہے؟ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اُکسے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، دیکھ کر سیکھ سکیں، برت کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشوونما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل دین اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمت اللعالمین کے چمن کے نونہال بار آور سایہ دار درخت بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا

ماحول مستفیض ہو اور ہر جگہ سے حکمت کو پس کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے۔ اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔ اعلیٰ حضرت، اکابرِ قوم اور بلند ہمت دوستو اور عزیزو، اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنانِ جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہو گا جس کی تعبیر نہ ہو سکے گی؟ اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا، لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمے بھی ہے۔

جیسا کہ آپ صاحبانِ اعلیٰ حضرت کی زبانِ مبارک سے ابھی سُن چکے ہیں، اس منصوبے کو ایک قدم اور آگے بڑھانے کے لیے ہم نے اگلے چند سال میں بعض کام شروع کرنے کا قصد کر ہی لیا ہے۔ طالب علموں اور اُستادوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ہوسٹل اور مکان فوراً بنوانے ہیں، چھوٹے بچّوں کی تعلیم کے لیے ایک اچھا کنڈرگارٹن بنانا ہے۔ ثانوی تعلیم میں ضروری تنوع پیدا کرنے کے لیے صنعتی اور تجارتی مدرسہ قایم کرنا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک اقامتی درس گاہ قایم کرنی ہے۔ علمی تحقیق کے ادارے قایم کرنے ہیں، جن میں سب سے پہلے اسلامی علوم کے تحقیقاتی ادارے، بیت الحکمتہ، کو صحیح اور مضبوط بنیادوں پر قایم کرنا ہے۔ اپنے مرحوم امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی یادگار کے طور ایک شفا خانہ بنانا ہے۔ کتب خانے کے لیے عمارت بنوانی ہے اور اس میں خصوصاً اسلام

اور ہندوستان سے متعلق کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کرنا ہے اور اس نوآبادی کے مرکز میں اس کے قلب کی حیثیت سے ایک مسجد تعمیر کرانی ہے۔ ان کاموں کے لیے میں نے اپنی ناتجربہ کاری میں دس لاکھ کا اندازہ کیا تھا۔ اس امید پر کہ جنگ کے بعد قیمتیں کچھ تو اپنی سابقہ حالت کے قریب آئیں گی، لیکن یہ خیال غلط نکلا اور اب اس کام کے لیے تقریباً تیس لاکھ کا اندازہ کیا جا رہا ہے۔ ہم نے قوم سے جوبلی کے موقع پر دس لاکھ روپیہ مانگا، دس لاکھ سے زیادہ تقریباً بارہ لاکھ روپیہ فراہم کرنے کا انتظام قوم نے کر دیا ہے، لیکن اب ان اٹھارہ لاکھ کا انتظام بھی تو اسی کو کرنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ انتظام بھی ہو ہی جائے گا، لیکن جلد ہو یا دیر میں، ہم نے کام شروع کرتے وقت کب پہلے روپیہ جمع ہونے کا انتظام کیا تھا کہ اب اس کے منتظر رہیں گے۔ یہ کام تو خدا نے چاہا تو ہوگا ہی، اگر یہ اچھا کام ہے تو خدا آپ سب کو اس کی تکمیل کی سعادت میں شرکت کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نے جامعہ کی پچھلی روداد اور اس کے اگلے منصوبوں کا ایک مختصر سا، ذرا منتشر سا، خاکہ پیش کر دیا ہے، اب اپنے سچے جذبات تشکر کا اظہار باقی ہے۔ سب سے پہلے اعلیٰ حضرت کا، اس عزت افزائی اور ہمت افزائی پر شکریہ، جو حضور نے یہاں تشریف فرما کر، اور جلسے کی صدارت فرما کر ہم کارکنانِ جامعہ کی کی ہے۔ حضور، یہ عزت افزائی اس لیے بھی ہے کہ خدا نے آپ کو اپنی زمین کے ایک حصے اور اپنی

مخلوق کی ایک معتد بہ آبادی کی پاسبانی سپرد فرمائی ہے، آپ کو دولت و اقتدار عطا فرمایا ہے۔ آپ نے، کہ بادشاہوں کی محفل کے لیے زینت ہیں، ہم فقیروں کی مجلس میں تشریف لانا قبول فرمایا۔ لیکن اعلیٰ حضرت سے زیادہ کس پر روشن ہوگا، اس لیے کہ آپ دونوں کے محرم ہیں، کہ اچھی دنیا میں مادی اقدار کو ذہنی اقدار کے سامنے اور دولت کو فقر کے سامنے جھکنا چاہیے۔ مادی اقدار اور دولت کے لیے یہ بڑی سعادت ہے کہ ذہنی اقدار اور فقر اُسے اپنی خدمت میں قبول فرمائیں۔ حضور کی تشریف آوری سے ہماری حقیقی عزت افزائی اور ہمت افزائی، آپ کے دولت و اقتدار ہی کے باعث نہیں ہے بلکہ اس فقر کی وجہ سے ہے جس کا اس لباس خسروی میں نباہ لے جانا ظاہری فقیروں کے فقر سے کہیں مشکل تر اور اس لیے بہت زیادہ واجب الاحترام ہے۔ ہم فقیروں کی عزت افزائی اس درویشِ خسروی، اس شاہ فقر شعار، اس امانت دار دولت و اقتدار کی تشریف آوری سے ہے، جس کی سروری خدمت گری ہے، اور بادشاہت عبدیت کی ذمے داریوں کو کما حقہ انجام دینے کا موقع۔ اعلیٰ حضرت ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

پھر قائدِ اعظم محمد علی جناح اور امام الہند ابو الکلام آزاد کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس جشن میں شرکت فرما کر ہمیں مفتخر فرمایا۔ آپ کی قوم کے چند بوڑھوں اور نوجوانوں نے خاموش تعلیمی کام کا ایک نمونہ اس جامعہ میں پیش کرنا چاہا ہے۔ آپ سے بہتر کون جان سکتا

ہے کہ قومی وجود اور قومی تہذیب کا تحفظ صرف اسے بگڑنے سے بچا کر نہیں ہو سکتا، بلکہ اسے بناتے رہنے کا طالب ہوتا ہے، آزادی ہو یا نو پذیر حیات تمدنی، یا اقدارِ عالیہ مطلقہ، یہ بس ایک بار حاصل کرنے اور سونپ کر رکھ دینے کی چیزیں نہیں ہیں، یہ انھیں کو ملتی ہیں اور انھیں کے پاس رہ سکتی ہیں جو ہر دم اُن کے از سرِ نو حصول، اور ہر دم از سرِ نو تخلیق کی دشواریاں انگیز کرنے پر تیار ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے، لیکن ہم ہندوستانی مسلمانوں میں اس تخلیقی عمل کے نمائندہ بننا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے کام کو پسند فرمائیں گے آپ کی پسند ہماری محنتوں کا بڑا انعام ہو گی۔

پھر پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر وزرائے حکومتِ ہند کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے ہماری اس تقریب میں شرکت کے لیے وقت نکالا۔ آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دُکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول، کیسے پیدا ہوں گے؟

حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دُنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچّوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سُنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچّہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے یہ وقت اِس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجیے۔

پھر ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے

ہمارے جشن میں شرکت فرماکر اس کو رونق بخشی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمارا دل بڑھایا، اس بدامنی کے زمانے میں سفر کی صعوبتیں برداشت فرمائیں۔ ہم شرمندہ ہیں کہ ان کے آرام و آسایش کا پورا انتظام نہ کر سکے، لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری ان فروگذاشتوں کو معاف فرمادیں گے۔ ان کارکنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خصوصاً عہدے دارانِ ریاست رام پور کا جن کی مدد کے بغیر ہم اپنے مہانوں کو اتنا آرام بھی نہ پہنچا سکتے، ان دوستوں نے ہمارے ساتھ اس طرح کام کیا کہ گویا یہ ان ہی کا کام تھا، اور سچ یہ ہے کہ ان کا کام اسی قدر تھا جتنا کہ ہمارا۔ ہم ان کی اس عنایت کو کبھی نہ بھولیں گے۔

آخر میں اعلیٰ حضرت، میں چند لمحوں کے لیے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کرکے اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا۔ حضور والا نے اپنے ارشاداتِ صدارت میں مجھ ناچیز کے متعلق جو فرمایا ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ کاش میں اس کا مستحق ہوتا۔ حضور، جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں، میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارے کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی ادارے کو نصیب ہوں گے۔ انھوں نے ان پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں

لائے، یہ قوم کے بچوں کے لیے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں۔ اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لیے ترسے ہیں، یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لیے اپنا سب کچھ بیچ چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا، یہ کتابوں کو ترستے ہیں۔ تحقیقی رسائل کو ترستے ہیں، انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے، اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لیے زمین خریدوا دیتے ہیں اور اپنے مطالبات کو مؤخر کر دیتے ہیں، یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لیے ایک فالِ نیک ہیں۔ انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے۔

آغشتہ اند ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ اند۔

میں قوم کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

قومی تعلیم کے مسائل ایک مسلمان کی نظر سے

(یہ خطبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں بطور
خطبۂ صدارت ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو بمقام علی گڑھ پڑھا گیا)

بزرگو اور دوستو!

مخلصوں اور قوم کے بہی خواہوں کا کوئی مجمع ہو اس کی صدارت کے لیے نامزد ہونا فخر کی بات بھی ہے اور بڑی ذمّے داری کی بھی۔ جسے ذمّے داریوں کے لیے اہلیت کا یقین تو کیا گمان تک نہ ہو، وہ فخر کیسے کرے؟ لیکن اہل ہو یا نہ ہو، فخر کر سکے نہ کر سکے، جب حکم ہو تو تعمیل ضروری ہے اور شکر گزاری لازم۔ حاضر ہوں اور شکر گزار۔

آج علی گڑھ میں اس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پچپنواں (۵۵) اجلاس ہے۔ پہلا اجلاس بھی یہیں، علی گڑھ میں، آج سے کوئی چھیاسٹھ (۶۶) سال پہلے ہوا تھا۔ جہاں آج یونیورسٹی کا مرکزی ہال ہے، وہاں ایک عارضی پنڈال بنا کر، اس کانفرنس کا پہلا اجلاس، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم و مغفور کی صدارت میں کیا گیا تھا۔ اس وقت جلسے میں شریک

ہونے والوں کے ذہن میں مشکل سے یہ بات آئی ہوگی کہ اس جگہ ایک بڑی یونیورسٹی قایم ہو جائے گی اور اس سے ہزاروں طلبہ فیض یاب ہوں گے۔ جدید تعلیم کی جس مخالفت کا مقابلہ کرنے وہ جمع ہوئے تھے اس کے لیے جمہور تشنہ ہوں گے اور وسائل کی کمی اس تشنگی کو تسکین کا ساماں فراہم نہ ہونے دے گی۔ کون سوچ سکتا ہوگا کہ اس انگریزی تعلیم کی جلو میں جو گتھیاں تھیں، اپنی حکومت کے ہاتھ سے جانے کے بعد ایک پردیسی راج کے زیرسایہ باعزت زندگی، یعنی دست نگری اور بے اختیاری اور بے بسی کے اس نامسعود عالم میں جتنی اور جیسی باعزت زندگی ممکن تھی، اس کا سامان فراہم کرنے والے ایک دن اس لیے جمع ہوں گے کہ آزاد خود مختار ملک میں باشرف زندگی کی تعلیمی اور تربیتی بنیادوں کو استوار کرنے کے وسائل پر غور کریں؟ حکومت کا آفتاب غروب ہونے کے بعد تاریکی میں ذہنی زندگی کا دیا روشن کرنے والوں کو آزادی کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد کے مسائل کا خیال کیسے آیا ہوگا؟ ایک مفلوک الحال جماعت کے رہنماؤں اور بہی خواہوں کو اپنی جماعت کے دل شکستہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کو سہارا دے کر کچھ سنبھالنے اور ان کے لیے روزی کے وسائل مہیا کرنے کی تکلیف دہ الجھنوں میں اس کو مہلت کہاں تھی کہ سارے ملک کے نظامِ تعلیم کی تشکیل کا وسیع تر اور دشوار تر کام بھی اپنے سر لے لیتے؟ آج کے بدلے ہوئے حالات میں ہو سکتا ہے کہ کوئی

ان کی تنگیِ نظر پر ناک بھوں چڑھائے، مگر سچ یہ ہے کہ جن حالات میں ان بزرگوں نے جو کام کیا، جس انتشار کا سامنا تھا اس میں جس یکسوئی اور پامردی کا ثبوت انھوں نے دیا، اپنی ہی قوم کی نادان اکثریت کی بے سمجھی اور تعصب کا جس صبر سے مقابلہ کیا، غلامی کی تیرگی میں جس طرح آزادیٔ فکر کا چراغ روشن کیا، تنگ دلی کے دور میں وسعت نظر پیدا کرنے کی جو کوشش کی، جمودِ ذہنی کے عالم میں تحقیق و تفتیش کی جو طرح ڈالی، توہّم و تعصب کے مقابلے میں جس طرح علم و دانش کو لا کھڑا کیا، قدامت پرستی کو جو ہر نئی چیز، ہر نئے خیال سے بدکتی تھی جس اصرار کے ساتھ یہ سبق سکھایا کہ اچھی بات کہیں سے آئے، مشرق سے کہ مغرب سے کسی سے ملے، اپنے سے کہ غیر سے، ہماری اپنی ہی کھوئی ہوئی پونجی ہے، اسے اٹھا لینا، اپنا لینا چاہیے، بے بسی اور بے وسیلگی کے عالم میں جس ہمت اور عزم سے انھوں نے قوم کی مخلصانہ بے غرض خدمت کی، ان سب باتوں کو یاد نہ کرنا اور ان پر احسان مندی کے دو پھول نہ چڑھانا بڑی ہی ناشکری ہوگی۔ ہمیں یہ سب یاد ہیں اور ان کے لیے ہمارے دل احسان مندی سے پُر ہیں۔ ان عاشقانِ پاک طینت کو خدا اپنی رحمتوں سے مالا مال فرمائے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ بدلے ہوئے حالات میں اسی عزم اور خلوص سے ہم اپنے قومی کاموں کو انجام دیں۔

صاحبو! میں نے ابھی بدلے ہوئے حالات کا ذکر کیا۔ ان حالات

کا تقاضا ہمارے کام کے لیے کیا ہے؟ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہیں۔ پہلے اس کا مطلب یہ تھا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی جو جماعت آباد ہے صرف اسی کے مخصوص مسائل پر غور و فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس جماعت کی فلاح و بہبود کی مخصوص راہیں تلاش کرنا ہمارا کام ہے۔ دوسروں سے ہمیں زیادہ سروکار نہیں، سوائے اس کے کہ ان کے مقابلے میں ہم نظرانداز نہ ہونے پائیں۔ حکومت کی چشمِ کرم کو اپنی طرف متوجہ کرانا چاہیے۔ رقیبوں پر التفات دیکھ کر کُڑھنا اور اس پر کچھ شکوہ شکایت کرنا بھی ساتھ ساتھ چلتا رہے تو کیا مضائقہ! جزو کی فلاح کے انہماک میں کُل کی بہبود کی مخالفت نہ سہی تو کم سے کم بے تعلقی کے ذریعے "یک سوئی" کا سامان تو کرنا ہی چاہیے۔ غیر ملکی اقتدار کی اس صورتِ حال نے قدرتی طور پر بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں اور بسا اوقات ہمارے مخلص سے مخلص رہ نماؤں کو بے جانے، بے ارادے، اس اقتدار کے شیطانی مقاصد کا آلۂ کار بننا پڑتا تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں بھی اس ملک کے مسلمانوں کے، جیسے کہ ہر دوسرے ہندستانی گروہ کے مخصوص مسائل رہیں گے، ود ان پر غور بھی ہمارا فرض ہوگا۔ لیکن ان مسائل کا اور ان پر غور و فکر کا پس منظر دوسرا ہوگا۔ اب ہمیں ان پر غور کرنا ہوگا اس نقطۂ نظر سے کہ کُل کی بہبود کے لیے جزو کی فلاح لازم ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ ہماری آزاد قومی زندگی کے کمال کی بنیاد اس کے اجزائے

ترکیبی کے نقش پر نہیں رکھی جاسکے گی۔ ہم مسلمان شہریوں کی ترقی کے مسائل سوچیں گے تو اس لیے کہ ان کا صحیح حل نہ ہونے سے مسلمانوں ہی کو نہیں ساری قومی زندگی کو نقصان پہنچے گا اور ان کے صحیح حل سے ساری قومی زندگی فروغ پائے گی۔

لیکن ان بدلے ہوئے حالات کا ایک تقاضا یہ ہے کہ ہمارے مخصوص مسائل کا پس منظر بھی بدل جائے گا تو ایک دوسرا تقاضا، اس سے بھی زیادہ اہم، یہ ہے کہ ہم پر اب نئے داری آئے گی کل قوم کے مسائل تعلیم و تربیت پر غور و فکر کی بھی۔ ہاں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں، ہندستان کے مسلمان شہریوں کی حیثیت سے سارے قومی تعلیمی مسائل پر بحث و تبصرے کی۔ مسلمان ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے دنیادی اور سیاسی مفاد کی اُدھیڑ بُن میں لگا رہتا ہے۔ مسلمان پر ساری دنیا کی ذمے داریاں بھی ہیں، اپنے ملک کی ذمے داریاں بھی ہیں۔ مسلمان ہونے کے معنی ہیں زندگی کا ایک مطمح نظر رکھنا، اقدار کا کوئی نظام ماننا، اخلاق کے کچھ معیار تسلیم کرنا، پست وبلند، خوب و زشت کے کچھ پیمانے برتنا، صالح انفرادی اور صالح اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ، فرد اور جماعت کے ربط کا کچھ تصوّر ذہن میں رکھنا، اور یہ سب محض ذہنی اور فکری تسکین اور توازن کے لیے نہیں بلکہ زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لیے، انفرادی تکمیل اور

اجتماعی ترقی کی راہیں متعین کرنے اور ان پر گامزن ہونے کے لیے، منزل کے تعین اور اس کی طرف بڑھنے کی توانائی حاصل کرنے کے لیے۔ یہ کانفرنس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے، اس معنی میں بھی کہ مسلمانوں کے مخصوص تعلیمی مسائل سوچتی ہے، اور اس معنی میں بھی کہ قوم کے تعلیمی مسائل پر اس روشنی میں جو ہمیں اپنے اسلامی طرز فکر اور اسلوب عمل سے ملی ہے غور و بحث کرتی ہے اور اپنی قومی تعلیم کے نظام کے بنانے میں اپنے فکر و عمل کا ہدیہ پیش کرتی ہے۔ قوم کا سارا کام اب ہمارا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی اور کا؛ ہم پر بھی اس کی راہیں روشن کرنے کا فرض ایسا ہی عائد ہوتا ہے جیسا کسی اور پر۔

ہندستان کے آزاد ہونے کے بعد چوں کہ اس کانفرنس کا یہ پہلا اجلاس ہے اس لیے جی چاہتا ہے کہ اس نئی ذمے داری کے پیش نظر ایک مسلمان شہری کی حیثیت سے ملک کے نظام تعلیم کے متعلق اپنے خیالات پیش کروں۔ ایک مسلمان تعلیمی کام کرنے والے کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی نظام کے بنانے میں سب سے اہم اصول یہ پیشِ نظر ہونا چاہیے کہ متعلم کی خداداد صلاحیتیں درجۂ کمال کو پہنچیں، پوری طرح نشوونما پائیں، اس کی انفرادیت میں یک جہتی پیدا ہو اور اس سے ایک یک سو سیرت بنے اور یہ یک سو سیرت اعلیٰ اخلاقی اقدار کی خادم بن کر شخصیت کے مرتبۂ بلند تک پہنچ سکے۔ انفرادیت سے سیرت، سیرت سے اخلاقی شخصیت، صحیح تعلیم کا یہی

راست مجھے اسلامی راستہ معلوم ہوتا ہے۔ تعلیم کے جو منصوبے وقتی جماعتی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر یا شخصی شکم پری کی رعایت سے بنائے جاتے ہیں وہ اور کچھ بھی کرتے ہوں اصولاً تعلیم و تربیت کا ذہنی سامان پوری طرح نہیں کر سکتے۔ پیٹ بھر لینے کی خاطر یا کسی سیاسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے کسی فرد سے اس کی فطرت اور قدرتی صلاحیتوں کی قربانی کا مطالبہ میرے نزدیک غیر اسلامی مطالبہ ہے۔ یہ مشیتِ ایزدی میں مداخلت کا ناپاک حوصلہ ہے۔ فطری جبلّت اور قدرتی صلاحیت کے نشو و نما کے پیشِ نظر، پورے نظامِ تعلیم کی تربیت، صحیح اسلامی کوشش ہوگی۔ ہمیں تعلیمی نظام کی ہر منزل میں اس اصول کی تفصیلات پر غور کرنا اور اس کی منزلوں میں سب منزلوں کو ترتیب دینا چاہیے۔ اس سے فرد کی صلاحیتیں نشو و نما پا سکیں گی؛ اسی سے فرد کا رابطہ جماعت اور اس کی تحصیلات و تخلیقات سے استوار ہو سکے گا؛ اس سے سیرت کی تربیت ہوگی؛ اس سے جماعتی مقاصد کی صحیح تکمیل ممکن ہوگی؛ اس سے سیرت، اقدارِ عالیہ کی چاکر بن کر، اخلاقی شخصیت بننے کا طرۂ امتیاز حاصل کر سکے گی۔

ذرا اس اجمال کی مختصر تفصیل کر دوں۔ اگر تعلیم سے مراد ذہن کی صحیح تربیت ہے تو یہ تربیت ذہن کو صحیح غذا پہنچانے اور اس غذا کو ہضم کرنے کے لیے صحیح ورزش کا انتظام کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ یاد رہے کہ ذہن کی غذا ذہن ہی ہے، یعنی تمدنِ انسانی کی وہ ان گنت

تخلیقیں جن میں ذہنِ انسانی اپنے کو رچاتا ہے، اپنی توانائی کے خزانوں کو ان میں لاکر جمع کر دیتا ہے۔ یہ اپنی فکر کی کاوشوں کو، اپنی جمالیاتی نظر اور مشاہدوں کو، اپنے افادی منصوبوں کو، اپنے دل کے ارمانوں کو، اپنی پسند کو، اپنی ناپسندیدگی کو، اپنے کشفِ حقائق کو، اپنی روح کی تسلیوں اور بے تابیوں کو، ان میں متشکل کر دیتا ہے۔ یہ سب ذہنی تخلیقیں ذہنی توانائیوں کا خزانہ ہوتی ہیں۔ ان ہی ذہنی توانائیوں سے دوسرے ذہنوں کی غذا کا کام لیا جا سکتا ہے۔ پابندی بس اتنی ہے کہ جس ذہن کی تخلیق سے غذا کا کام لینا ہے اس کی ساخت اور جس ذہن کو غذا پہنچانی ہے اس کی ساخت میں مناسبت ہو۔ نہ ہر جسمانی غذا ہر جسم کے لیے ایک سی مناسب ہوتی ہے نہ ہر ذہنی غذا ہر ذہن کے لیے۔ پہلی صورت میں مناسبت کی حدیں ذرا وسیع ہیں، دوسری میں شاید اتنی وسیع نہیں۔

ذہنِ معروض اور ذہنِ موضوع میں مطابقت اور مناسبت کا خیال رکھنا تعلیم کا بنیادی گر ہے۔ جیسے بہرے کے ذہن کی تربیت موسیقی سے نہیں کی جا سکتی، جیسے اندھے کے ذہن کی نشوونما کے لیے مصوری سے کام نہیں لیا جا سکتا، اسی طرح جس ذہن کی ساخت ادبی اور تخلیقی ہو اس کو صنعت کے سرمایۂ تمدن سے، جس کی ساخت نظری ہو اس کو عملی اشیا سے تربیت نہیں دی جا سکتی۔ اس میں ضد کرنا قدرت کے منشا کی نافرمانی کرنا ہے، ذہن کی تربیت کی راہ کو بند کرنا

ہے، آدمیوں کو میاں مٹھو بنانے کی نامبارک کوشش ہے۔

تعلیم کی ہر منزل میں اس حقیقت کے کچھ مطالبے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کی منزل میں اس کا تقاضا کیا ہے؟ یہ وہ منزل ہے جہاں متعلمین کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں اگر ذہنی ساختوں کا بھرپور تنوع ہوتا تو نظام تعلیم کی تشکیل میں بڑی دشواریاں ہوتیں۔ حسنِ اتفاق کہ قدرت نے کچھ ایسا انتظام کیا ہے کہ عمر کی اس منزل میں لڑکے لڑکیوں میں عملی رجحان بہت عام بلکہ کم و بیش عالم گیر کر دیا ہے۔ اس عمر کے فطری تقاضوں میں ہے کہ بچے کچھ کرنا چاہتے ہیں، کچھ بنانا چاہتے ہیں، بگاڑنا چاہتے ہیں، جوڑنا چاہتے ہیں، توڑنا چاہتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھوں کی مدد سے سوچنے، برت کر پہچاننے، کچھ کر کے سیکھنے کا انتظام فطرت کی طرف سے ہوا ہے۔ "اُدھر کا اشارہ" صاف اور واضح ہے کہ مدرسہ بس نادانی اور ضد ہی میں اسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ لازم ہے کہ اس منزل میں عملی کام کو تعلیم کا یعنی تربیت ذہنی کا وسیلہ اور اس کا مرکز بنایا جائے۔ اس منزل میں ذہن کی قوتوں کو پیدا کرنے میں ہاتھ کا کام کتاب سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ پھر حسنِ اتفاق دیکھیے کہ یہ جو ذہنی تربیت کا مطالبہ ہے، جماعت کے اغراض کا تقاضا بھی یہی ہے۔ جماعتی زندگی کے قایم و برقرار رکھنے کے لیے سوادِ اعظم کا ہاتھ کے دولت آفریں کام میں مصروف ہونا ضروری ہے۔ صرف کتابیں پڑھا پڑھا کر اور

اس طرح پڑھا کر کہ بڑے منشی پیدا ہوں، کھیت اُجاڑ ہو جائیں اور کارخانے ویران، دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ یا سب ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ذہنی تربیت سے ہی محروم رکھنا ایسی جماعتی معصیت ہے کہ جس کی اصلاح وہ بُحرانی شکلیں اختیار کرتی ہے کہ ایک بار تو جماعت کا نظام درہم برہم ہو ہی جاتا ہے۔ پھر اگر جماعت کا نظام امارتی ہو، مدرسے صرف اوپر کے چند خاندانوں کے بچّوں کی تربیت کا کام کرتے ہوں، انھیں کو پڑھانا لکھانا، انھیں کو اوروں سے ممتاز کرنا اور الگ رکھنا، ان کا مقصد ہو تو یہ بات کچھ سمجھ میں بھی آئے کہ خود غرض بدنصیب اپنے تفوق کو قایم رکھنے کے لیے دوسروں کے بچّوں کو ہی نہیں خود اپنے بچّوں کو صحیح ذہنی تربیت سے محروم کرتے اور خالی ملمع کاری پر راضی رہتے ہیں۔ لیکن ایک جمہوری ریاست میں، جیسی کہ ہماری ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہمارے ملک میں دس بارہ سال سے ہاتھ کے کام کو مدرسوں میں مرکزی جگہ دینے کی تجویز لوگوں کے سامنے ہے اور 'بنیادی تعلیم' کے نام سے معروف ہے۔ تقریباً سارے ملک میں نام تو رائج ہو گیا ہے، لیکن مدرسوں کی ماہیت اور ان کی روح، سچ تو یہ ہے کہ، پوری طرح معقول درجے تک بھی بدلی نہیں ہے۔ اس کانفرنس کو کوشش کرنی چاہیے کہ نام کے ساتھ کام بھی بدلے اور اس تبدیلی کے پیدا کرنے میں کوئی چیز بھی اتنی مؤثر نہیں ہو سکتی جتنی کہ مثال۔ پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ پر چلنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ محتاط لوگ جھجکتے ہیں،

کم حوصلہ لوگ ٹھٹکتے ہیں، کوئی ہمت والا آگے بڑھ نکلتا ہے تو یہ پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ جو مدرسے مسلمانوں کے انتظام میں ہیں ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں تعلیم کے اس صحیح اصول پر چلنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں اس نئے کام میں اولیت کا شرف مل سکتا ہے۔ مگر اس کام کو ٹھیک ڈھنگ پر ڈالنے کے لیے بہت کچھ سوچنا ہے، بہت کچھ کرنا ہے۔ ہاتھ کے کام کی تعلیمی تربیتی تاثیر سے پورا فائدہ کیوں کر اٹھایا جا سکتا ہے، اسے کتنا وقت دینا چاہیے، اس میں تھکن کب پیدا ہونے لگتی ہے، ہاتھ کے کام سے دوسری معلومات اور مہارتوں اور میلانوں کو کس طرح مربوط کیا جائے، کام کو جماعتی احساس کا معین کیسے بنایا جائے، مربوط درس کے لیے استادوں اور شاگردوں کو کس قسم کے امدادی سامان کی ضرورت ہوگی، اسے کس طرح فراہم کیا جائے، یہ اور ایسے بے شمار سوالات تشنۂ تحقیق ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ تعلیم اگر اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے، ایک نمونے کا بنیادی مدرسہ قایم کرے اور بنیادی تعلیم سے متعلق مسائل کی تحقیق کے نتائج ملک کے سب کام کرنے والوں کے لیے شائع کرے تو ایک اہم قومی کام اس کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے۔ خدمت میں سرداری کے راستے بند نہیں ہیں!

تعلیم کے اس صحیح اصول کا تقاضا ثانوی منزل میں، جب کہ ذہنی صلاحیتوں میں تفریق شروع ہو جاتی ہے، کیا ہے؟ اس تفریق کو سمجھنا، اس عمر میں اشکالِ نفس کے متنوع سانچوں کو پہچاننا، ثانوی تعلیم کے

نظام کو درست کرنے کی پہلی منزل ہے۔ ان مختلف اور متفرق صلاحیتوں کے پیشِ نظر اور ان کے مناسب مطابق کئی قسم کے ثانوی مدرسے قایم کیے جانے چاہئیں۔ شاید تین قسم کے ثانوی مدرسے تو قائم کرنے ہی پڑیں: ایک وہ جن میں لسانی و تاریخی میلان طبع کا لحاظ رکھ کر اس کے مناسب حال تمدنی اشیا سے تربیتِ ذہنی کا اہتمام ہو، ایک وہ جن میں علمیاتی صنعتی صلاحیتیں پیشِ نظر رہیں، ایک وہ جن میں جمالیاتی تخلیقی میلانات کو مرکز تعلیم بنایا جائے۔ یہ شاید ضرور کرنا پڑے کہ ان مدرسوں میں ان کا مخصوص اور امتیازی نصاب طالب علم کے پورے وقت کو نہ گھیرے، کچھ اور مشاغل کے لیے بھی جگہ رہے تاکہ اگر کوئی صلاحیت دیر میں اُبھرے تو وہ بھی بر روئے کار آسکے۔ یا اگر شکل نفسی کی تشخیص میں سہو ہوا ہو تو اس کی اصلاح کی جا سکے۔ ایسا کرنے میں خیال یہ ہوتا ہے کہ ثانوی منزل کی تعلیم طلبا کی مخصوص صلاحیتوں کی تربیت کرے گی، یعنی زندگی میں وہ جو کچھ بننے والے ہیں اس کے لیے انھیں تیار کرے گی، یعنی پیشے کی تعلیم ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں تعلیمی مسائل پر سوچنے والوں میں مدت سے ایک بحث چل رہی ہے، وہ یہ کہ ثانوی تعلیم عام ذہنی تعلیم ہو یا مخصوص پیشے کی تعلیم۔ لفظوں کے گورکھ دھندے نے اس بحث کو بہت پیچیدہ کر دیا ہے۔ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ لڑکا جو ثانوی مدرسے سے نکلے وہ فر فر سنسکرت یا نہیں تو فر فر عربی بولتا ہو، جیسے ایک مشہور جرمن معلم کی خواہش تھی کہ جرمنی کا ہر نوجوان، چاہے کسان کا بیٹا ہو چاہے قیصر کا ولی عہد ہو،

یونانی ضرور بول سکے! اس لیے کہ "عام کلچر" تو اسی طرح حاصل ہوسکتی ہے! اور آج کل کے "عام کلچر" کے حامی تو صرف سنسکرت اور عربی یا یونانی پر کب راضی ہوتے ہیں، وہ تو چاہتے ہیں کہ "عام کلچر" کے دسترخوان پر کچھ نہ ہوں تو ایک درجن کھانے تو ہوں! انسانیت نے چھ ہزار سال میں جو کچھ کیا ہے اس سے ہر نوجوان کو کچھ نہ کچھ تو آشنا ہونا ہی چاہیے اور یہ بھی چینیوں کی طرح ۷۰ سال کی طولانی طالب العلمی میں نہیں، کہ چین میں یہ فضیلت کا امتحان اسی عمر میں ہوا کرتا تھا، بلکہ ۱۵ یا ۱۶ سال ہی کی عمر میں! مدرسے میں مضامین کی کثرت، اور ہر تحریک اصلاح کے موقع پر اس میں ایک دو کا اور اضافہ، کوئی غیر معروف بات نہیں ہے۔ کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ اس سے کیسا اتھلاپن پیدا ہوتا ہے۔ بس خالی ملمع چڑھا لو، کہ تعلیم ملمعے کا نہیں حقیقی تشکیل کا نام ہے، خالی اوپر سے نہیں چمکاتی، اندر سے بدلتی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اپنے کام کو اچھی طرح جاننا، اس کی ماہیت، اس کی غرض و غایت کو سمجھنا اور اسے خوبی سے انجام دینے میں اپنے ارادے اور اپنی قوتِ عمل کو صرف کرنا، یہی تعلیم کا اصل راز ہے، اس کا پہلا اور لازمی قدم ہے۔ ایک بڑے معلم نے خوب کہا ہے: "پیشے کی تربیت انسانی تربیت کا دروازہ ہے"! اگر ہمارا نوجوان سنسکرت یا عربی بول لے مگر کھیت میں ہل کو نہ سنبھال سکے، باتیں بنا سکے اور کام سے بھاگے، تو جمہوری جماعت میں اس کی تعلیم کیا کام دے گی۔ ہاں، ایک طرفہ تماشا یہ ہے کہ آدمی نے اپنی ناسمجھی اور حماقت کی ساری پونجی خرچ کر کے کچھ ایسے

انتظامات کیے ہیں کہ پیشے کی تعلیم ذہنی تربیت سے یکسر عاری ہو جائے، بس اسے کسی کام کے طریقۂ کار تک محدود کر دیا جائے، خالی ہنر مندی کو اس کا مقصد بنا دیا جائے اور اس واضح حقیقت کو نظر انداز کر ڈالا جائے کہ کوئی پیشہ خلا میں بے تعلق و بے ربط نہیں ہوتا، زندگی کے ایک خاص نمونے کا حصہ ہوتا ہے اور اس کے مجموعی ماحول سے ہی اس کی غرض اور غایت، ماہیت اور اہمیت متعین ہوتی ہے۔ اگر پیشے کی تعلیم میں جزوی مہارت کے ساتھ اس بات کے ذہن نشین کرانے کا اہتمام بھی ہو سکے کہ یہ جزوی ہنر مندی ایک کُل کی خادم ہے، اس سے وابستہ ہے، اسی سے اس میں معنی پیدا ہوتے ہیں اور اس کُل میں اپنا جزوی وظیفہ بہ خوبی انجام دینا ہی کُل کی صحیح خدمت ہے۔ تو یہ پیشے کی تعلیم 'کلچر' کا اور چیزوں سے کہیں زیادہ موثر وسیلہ بن جائے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ طلبا کی مخصوص صلاحیتوں کا لحاظ کرنے والے قسم قسم کے ثانوی مدرسے قایم ہوں۔ انھیں ہمہ دانی کے خبط سے نجات دلائی جائے؛ مشاہدے اور تجربے اور عملی کام کے مواقع بڑھائے جائیں؛ "عام کلچر" والے اس پر طعن کریں تو اسے بھی مہذب آدمی کی طرح سہ لیا جائے۔ ان بزرگوں پر بھی کبھی نہ کبھی یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ تعلیم تمدن کے کسی مخصوص جزو کی مدد ہی سے تمدن کی وسعتوں کا محرم بنا سکتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ پہلے اسے پورا متمدن انسان بنا لیا جائے ـــ سنسکرت اور عربی بولنے والا انسان! ـــ عام ہمہ گیر کلچر

اسے دے دیا جائے اور پھر اس کے بعد مخصوص صلاحیتوں کی تہذیب کی فکر کی جائے۔ مخصوص صلاحیتوں کو پہلے مہذب کرنے سے ہی عام تمدنی زندگی کا دروازہ کھلتا ہے۔ ثانوی منزل میں طلبا کی مخصوص صلاحیتوں ہی کو، چاہے محدود ہی ہوں، نشوونما دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے ختم پر انھیں اس قابل ہونا چاہیے کہ اپنی صلاحیتوں کے مناسب حال زندگی کے کسی کام میں لگ سکیں۔ "عام کلچر" حاصل کرنے کا موقع اعلیٰ تعلیم میں ہوگا یا ساری زندگی میں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ثانوی تعلیم کی اصلاح کا مسئلہ ہمارے تعلیمی نظام کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور ثانوی تعلیم کی اصلاح کے بغیر، یا یوں کہیے کہ جب تک ہم اسے اعلیٰ تعلیم کی تیاری کی بس ایک منزل بنائے رکھیں گے اور خود اس کے اپنے مقاصد پیش نظر نہ ہوں گے، ہمارا سارا تعلیم کا کام غیر متوازن اور بے بار رہے گا۔ بنیادی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم کے مسائل پر غور و تحقیق کے لیے حکومت کی متعدد کمیٹیاں اور کمیشن کام کر چکے ہیں۔ ثانوی تعلیم کے بنیادی مسائل منتظر توجہ ہیں اور ضرورت ہے کہ ایک ماہر کمیشن اس باب میں رہ نمائی کرے بشرطیکہ دکھائی ہوئی راہ پر کوئی چلنے کو بھی آمادہ ہو۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس سرکاری تحقیق کا انتظار کیے بغیر ہی ہم کہیں مخصوص صلاحیتوں کی رعایت رکھ کر، ان سے مناسبت رکھنے والی تمدنی اشیا سے ثانوی تعلیم کا انتظام کر سکیں تو بہت اچھا ہو۔ کم سے کم تین مدرسے الگ الگ ایک ایک

اس قسم کا جس کا میں نے ذکر کیا ہے، یا تینوں ایک ہی چھت تلے قایم کریں تو یہ کام آئندہ تحقیق کے لیے خود رہ نما ثابت ہوگا۔ خود مسلم یونیورسٹی اپنے ثانوی مدارس کی تشکیلِ نو کا کام اس اصول پر کر سکے تو بڑی تعلیمی خدمت انجام پا سکتی ہے۔ دینی تعلیم کا ایک ثانوی مدرسہ بھی اس اصول پر قایم کیا جائے تو دینی تعلیم کی انجام دہی کے لیے تربیت یافتہ نوجوان مل سکیں اور مسلمانوں کی ایک اہم ضرورت مناسب اور مؤثر طریقے پر پوری ہو سکے۔

بنیادی اور ثانوی تعلیم کی اصلاح کا کام بہت کچھ ہماری تعلیم گاہوں کے فارغ نوجوانوں کی توجہ کا محتاج ہے۔ معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ یونیورسٹیاں زندگی کے ان مسائل کو اپنی شان علم و تجربے سے فروتر سمجھتی ہیں۔ یوں تو نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے خاصا کام کیا ہے، ملک کے کاروبار کا بڑا حصہ بہرحال، برا یا بھلا، انھیں کے فارغ طلبہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ بعض ممتاز عالم اور سائنسنسٹ بھی انھوں نے پیدا کیے ہیں جنھوں نے ہندستان کا نام دنیا میں روشن کیا ہے۔ لیکن ہمارا کام بہت پھیلا ہوا کام ہے اور سچ یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اس کا پورا حق نہیں ادا کر رہی ہیں۔ یہ کافی نہیں ہے کہ چند نامور ماہران سے نکل آئیں، یہاں تو زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھنے والوں، راہ دکھانے والوں، راہ طے کرنے والوں کی مانگ ہے، ایسے آدمیوں کی جو حقائق سے بھاگتے نہ ہوں، جو ہماری حیاتِ قومی کے گہرے تقاضوں کو سمجھتے ہوں، اور

انھیں پورا کرنے میں دل و جان سے لگ جانے کو آمادہ ہوں۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارا علم کتابوں تک اور درس گاہوں کی چہاردیواری تک محدود ہوتا ہے اور جماعتی افادیت سے کچھ جھینپتا سا ہے۔ ذرا پوچھیے، کیا ہماری زراعت کو یونیورسٹیوں نے بہتر بنایا ہے؟ کیا ہماری صنعت کو انھوں نے فروغ دیا ہے؟ کیا ہمارے تعلیمی منصوبے ان کے یہاں بنتے ہیں؟ کیا ہمارے ادب میں یونیورسٹیاں بہت کچھ ترقی کا باعث ہوئی ہیں؟ کیا انھوں نے اپنے طلبہ کے انتخاب کے لیے کوئی اصول بنائے ہیں؟ کیا طلبہ کی علمی اور شخصی زندگی میں پختہ کار مشیروں سے صلاح مشورے کا کوئی نظام بنایا ہے؟ کیا انھوں نے اپنے امتحانات کے صلاحیت کُش نظام کو بدلنے کی تدبیریں کی ہیں؟ "خبر" کی بجائے "نظر" کی پرورش اور تربیت کا کوئی ڈھنگ نکالا ہے؟ انھیں یہ سب ہی کام کرنے ہیں اور ان کے لیے ضرورت ہے وسائل کی اور مادّی وسائل سے زیادہ شوق، محنت اور آزادی کی، اپنے کام کو قومی زندگی سے مربوط کرنے کی، انھیں قوم کی حیات ذہنی کا مرکز بنانے کی، تاکہ یہ قوم کی علمی اور ذہنی متاع کی حفاظت کریں، ضرورت کے وقت اس میں مناسب اضافہ و ترمیم کرتی رہیں اور اس اضافے کے ساتھ اگلی نسلوں تک اس امانت کو پہنچا دیں۔ بیج کی حفاظت اور بیج کی تلاش ان کا کام ہے اور قومی زندگی کی ترقی اور اس کا سدھار ان کا منصب۔ یونیورسٹی اور زندگی کے درمیان

جو دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں وہ گرنی چاہئیں۔ خدمت کا راستہ استوار ہونا چاہیے۔ قومی سرمایے کا ان پر فیاضانہ صرف ہونا چاہیے اور باوجود اس صرف کے انھیں بالکل آزاد چھوڑنا چاہیے۔ تلاشِ حق کا پودا آزادی ہی کی فضا میں پنپتا ہے۔ مبارک ہے وہ قوم جو اپنی اعلیٰ تعلیم گاہوں کی جی کھول کر مدد کرتی ہے اور ان کے کام میں کسی طرح دخل انداز ہونا نہیں چاہتی۔ اور مبارک ہے وہ یونیورسٹی جس کے کارکن اس راز سے واقف ہو جائیں کہ علم جب عمل کا جامہ پہنتا ہے اور زندگی کا خادم بنتا ہے، اس کی حقیقت تب ہی کہیں منکشف ہوتی ہے اور علم میں حیات پروری کی صفت اس وقت آتی ہے جب وہ خلق خدا کی زندگی کے کام آتا ہے۔ میرا ارمان ہے کہ جس یونیورسٹی سے میرا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے اب کوئی چالیس برس سے ہے اور جس سے اس وقت میں ایک ذمے دار حیثیت سے وابستہ ہوں اور جو آپ سب کی بھی آنکھ کا تارا ہے، وہ ہندستانی جامعات میں اسی اعتبار سے ایک ممتاز رتبہ حاصل کرے۔ اس کے بنانے میں ہندی مسلمانوں کی بہت کچھ محبت، محنت، دولت، ان کا بہت کچھ جوش اور خلوص کام آیا ہے۔ اگر یہ قومی زندگی میں وہ مرتبہ حاصل کرلے جس کا میں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان آرزو مند ہے، تو اس ملک میں مسلمانوں کے لیے باشرف و باعزت شہریت کی ضمانت ہو جائے کہ جمہوریت میں امتیاز شرفِ خدمت اور خوبی ہی سے حاصل ہوتا ہے اور انھیں سے قایم رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم یہ استحقاق

آزاد ہندی جمہوریت میں ضرور قایم کر سکیں گے۔

اس مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں اس محترم مجمعے کے سامنے چند ضروری باتیں بیان کر دوں تو شاید بے محل نہ ہو۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ چند مہینے ہوئے اس یونیورسٹی کے قانون میں ہندوستانی پارلیمنٹ نے کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ بعض لوگوں نے ان تبدیلیوں کی غلط تعبیر کرنی چاہی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ میں اپنا خیال ان کے متعلق ظاہر کر دوں۔ علاوہ بعض جزوی تبدیلیوں کے جو تجربے نے ضروری کر دی تھیں اور جو تینوں مرکزی یونیورسٹیوں کے قانون میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے کی گئیں دو اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پہلے یہ کہ پُرانے قانون کی رو سے کوئی غیر ہندو ہندو یونیورسٹی میں اور کوئی غیر مسلم مسلم یونیورسٹی میں کورٹ کا رکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اب یہ قید دونوں جگہ ہٹا دی گئی ہے۔ لوگ جلد بازی میں یہ سمجھتے یا سمجھاتے ہیں کہ اس تبدیلی کا مقصد یہ ہے کہ ان اداروں کی ماہیت ہی بدل دی جائے۔ یہ مسلم اور ہندو ادارے نہ رہیں، اس لیے کہ ایک غیر دینی جمہوری ریاست میں ہندو مسلم اداروں کی جگہ نہیں ہے۔ یہ بڑی بھول ہے اس سلسلے میں یہ واضح رہے کہ پہلے تجویز تھی کہ ان جامعات کا نام بھی بدل دیا جائے، اور ان ناموں میں سے ہندو اور مسلم کے لفظ نکال دیے جائیں۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے سامنے بھی یہ سوال گیا تھا، مگر انھوں نے ایسا کرنے کی سفارش نہیں کی اور وزارت تعلیم نے اس تجویز کو چھوڑ دیا۔ یہ یونیورسٹیاں پہلے کی طرح بنارس ہندو یونیورسٹی اور

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی کہلائیں گی۔ پھر پُرانے قانون میں یونیورسٹی کے جو اختیارات تھے وہ ویسے کے ویسے ہی نئے قانون میں بھی رکھے گئے ہیں۔ ان میں جو اختیار مشرقی اور اسلامی علوم کی ترویج اور مسلم دینیات اور مذہب کی تعلیم کا اس یونیورسٹی کو تھا وہ اس طرح برقرار ہے، جیسے بنارس کے قانون میں مشرقی، ویدک، بودھ اور جین علوم اور ہندو مذہب کی تعلیم کا اختیار۔ ان بظاہر متناقص سی باتوں سے اس تبدیلی کے معنی یہی سمجھ میں آسکتے ہیں کہ ایک غیر دینی جمہوریت میں مرکزی اداروں کی حیثیت سے ایک ہندو اور ایک مسلم یونیورسٹی ہو گی۔ اس لیے کہ غیر دینی جمہوریت ہی میں اتنی رواداری، اتنی غیر جانب داری، اتنی وسعت قلب و نظر ہو سکتی ہے کہ اس میں دونوں مرکزی اداروں کی حیثیت سے قایم رہیں۔ ان جامعات میں مذہبی تعلیم کا انتظام ہوگا، اس لیے کہ غیر دینی ریاست کسی مذہب کی مخالف نہیں ہوتی، وہ غیر جانب دار اور روادار ریاست ہوتی ہے۔ خود کسی عقیدۂ مذہبی سے وابستہ نہیں ہوتی، لیکن قومی زندگی کے تمام قابلِ قدر عناصر کی حفاظت اور ہمت افزائی اس کا کام ہوتا ہے۔ اس کے ادارے اپنی امتیازی خصوصیات برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ان کے 'کورٹ' میں غیر مسلم اور غیر ہندو اراکین کو شامل کر سکنے کا امکان پیدا کر کے صرف اس بات کا اہتمام مقصود ہے کہ اہم قومی مرکزوں میں یہ جدائی قانونی طور پر لازم قرار نہ دی جائے۔ یہ ادارے اپنی خصوصیات قایم رکھیں لیکن ان کے کام میں دوسرے اہلِ ملک کا

مشورہ ممنوع نہ ہو۔ یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ جن لوگوں نے یہ ادارے بنائے ہیں، ان کی روایات بنائی ہیں، ان کے مقاصد متعین کیے ہیں، وہ ان سے ہٹائے جائیں اور دوسرے لوگ ان کی جگہ لے لیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ سید احمد خاں کے وقت سے اس ادارے کے تعلیمی کام میں سب قوموں کے ممتاز آدمیوں نے حصّہ لیا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو، سکھ، عیسائی، عرب، جرمن سب ہی دوش بہ دوش کام کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے کام میں ان کے مشورے کو شامل کرنا یونیورسٹی کی ماہیت بدلنے کی خاطر نہیں ہے، اس کے کام کو مضبوط کرنے کے لیے ہے۔

دوسری تبدیلی مذہبی تعلیم سے متعلق ہے۔ ہمارے پرانے ضابطے کے مطابق دینیات کی تعلیم ہر مسلمان طالب علم کے لیے لازمی تھی۔ دستورِ ہند کی دفعہ ۲۸ کی رو سے کوئی ادارہ جسے حکومت کی مدد ملتی ہو اپنے طلبہ کو ان کی مرضی کے خلاف کسی قسم کی مذہبی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، لیکن مذہبی تعلیم کا بہتر سے بہتر اہتمام کر سکتا ہے، تاکہ جو طلبہ یہ تعلیم حاصل کرنا چاہیں انھیں یہ تعلیم دی جا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تبدیلی سے ہمارے یہاں دینی تعلیم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ امید ہے کہ فائدہ ہوگا۔ اس سے دینی تعلیم کا معیار اونچا ہوگا۔ طریقۂ تعلیم بہتر ہوگا، اس کی تاثیر بڑھے گی۔ لازم کر دینے کے بعد تعلیم کو دل کش اور دل نشیں، مؤثر اور کارگر بنانے کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہٹی رہی ہے۔ اختیاری ہونے کی صورت میں اس کے نہج کو درست کرنے اور جاذبِ توجہ

بنانے کا خاص اہتمام کرنا ہوگا اور انشاء اللہ کیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کو بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کرنے کا موقع ہے۔ لازمی مذہبی تعلیم کی کوئی تین چوتھائی صدی میں تو ہم اپنے اسلامی مدرسوں اور کالجوں کے لیے دینیات کا کوئی قابل اطمینان نصاب بھی نہ بنا سکے! اب اس کام کو کرنا چاہیے۔ دین کی قانونی اور فقہی موشگافیوں کو تعلیم دین کا مرکز بنانے کی جگہ شاید ہمیں اپنے نئے نصاب میں اس کی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرنے والی، فکر و عمل کی سمت درست کرنے والی، زندگی کو نوامیس قدرت سے ہم آہنگ بنانے والی، روح کو تڑپانے اور دل کو گرمانے والی، سیرت کو یک سو اور شخصیت کو مضبوط بنانے والی صفتوں کو اجاگر کرنا زیادہ ضروری معلوم ہو۔ شاید اب ہم اس کی مرکزی تعلیمات، قرآن کے انقلاب انگیز پیام سے، اور اس کی عملی انسانی تکمیل کو اسوۂ حسنہ نبویؐ سے ذہنوں اور دلوں میں پہنچانے پر زیادہ توجہ کریں۔ میرا ارادہ ہے کہ بہترین مفکروں اور معلموں کی مدد سے یہ نصاب مرتّب کراؤں اور اس کے طرقِ تعلیم میں بھی ضروری تبدیلیاں کروں۔ اگر ایسا ہو سکا، اور اس میں آپ سب کی مدد شامل رہی تو انشاء اللہ ضرور ہو سکے گا، تو اختیاری ہونا دینی تعلیم کے لیے مبارک ثابت ہوگا۔ مذہب لڑنے لڑانے کا ہتھکنڈا نہ ہوگا بلکہ زندگی کو معنی و مقصد بخشے گا، اس کے لیے ایک اخلاقی اور روحانی اساس مہیّا کرے گا، اقدارِ عالیہ سے تعلق و شیفتگی پیدا کرے گا، اپنی نورانی قوت سے زندگی کو روشن اور اپنی تخلیقی طاقت سے اسے مالا مال کر سکے گا۔

دوستو! میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹیوں کے قانون میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے صحیح منشا کو جاننا اور اس کا اوروں کے علم میں لانا ہمارا ضروری کام ہے۔ علی گڑھ کو بدنام کر کے مسلمانوں کے دل میں اس کی محبت کو کم کرنا نہ علی گڑھ کے ساتھ نیک سلوک ہے، نہ مسلمانوں کے ساتھ، نہ ہندوستان کے ساتھ۔ میرا تو یقین ہے کہ علی گڑھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اہم کام علی گڑھ ہی کے حصے میں آیا ہے اور علی گڑھ ہی اسے انجام دے سکے گا۔ جیسا کہ صدر جمہوریہ کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے موقع پر میں نے کہا تھا "وہ کام ہندستانی تدبر اور ہندستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے، یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں ۴ کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے اور کیسا دل کش کام، یہ مختلف تمدنی و تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین و جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے۔ ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندستانی کی مشترکہ میراث بنا دینا، کہ سب ہمارے ہی گم شدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالا مال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جدوجہد کا ولولہ بخشنا کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور

ہندستانی زندگی کو صالح زندگی بنانے میں ان کا مخصوص منصب، یہ ان پر ذمّے داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں، یہ بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟" اور پھر میں نے عرض کیا تھا کہ علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے خدمت کی جو پیش کش دے سکے گا اس سے متعین ہوگا۔ ہندستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام۔ اور ہندستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر، ہاں اس پر، بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ علی گڑھ قومی زندگی کو مالا مال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے گا اور مجھے بھروسا ہے کہ ہماری قوم بھی اس کے کام کی قدر کرنے میں بخل نہ کرے گی۔

آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ حکومت ہند نے پچھلے دو سال میں ہماری خاصی امداد کی ہے۔ ہمارے انجینیرنگ کالج کی توسیع کے سلسلے میں چار لاکھ پینسٹھ ہزار روپے عمارت کے لیے اور دس لاکھ روپے سامان کے لیے منظور فرمائے ہیں۔ سائنس کی تعلیم میں توسیع کے لیے بھی ایک کثیر رقم دی ہے۔ مستقل سالانہ امداد جو تین لاکھ تھی اور چند دوسرے مخصوص مقاصد کے لیے مقررہ امداد سے مل کر چھے یا ساڑھے چھے لاکھ ہو جاتی تھی، اس کے بجائے ساڑھے بارہ لاکھ کی مستقل امداد مقرر فرمائی ہے۔

ابھی ہمارے عورتوں کے کالج کی عمارت کی تکمیل کے لیے ایک لاکھ کی رقم منظور کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہماری مالی دشواریاں پوری طرح حل نہیں ہوئی ہیں اور توسیع کے بہت سے کام رُکے ہوئے ہیں، خصوصاً زراعتی کالج اور میڈیکل کالج کے قیام کا معاملہ ابھی رُکا ہوا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کام بھی شروع ہو ہی جائیں گے، اور ہمیں حکومت سے ان کے لیے بھی ضرور مدد ملے گی۔ مگر میں آپ سے صاف کہہ دوں کہ میں اس جامعہ کو صرف حکومت کی مدد سے نہیں چلانا چاہتا۔ اس کے لیے قوم کو حکومت سے الگ بھی کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ تعلیمی ادارے کا کام پورا نہیں ہوتا جب تک اس کی کوششیں جماعتی زندگی پر اثر انداز نہ ہوں اور اس کی خدمت میں نہ لگیں۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی خدمتیں بھی قوم کو اس وقت تک راس نہیں آئیں جب تک وہ اپنے کو اس سے اتنا وابستہ نہ سمجھے کہ اس کی خاطر اپنی جیب میں بھی کبھی کبھی ہاتھ ڈالے۔ آپ متعجب نہ ہوں اگر میں ایک دن کاسۂ گدائی لے کر قوم کے سامنے آؤں اور آپ سب سے اس میں مدد کا طالب ہوں۔ حکومت ہماری ہے وہ ہمارے کام کی مدد کیوں نہ کرے گی۔ مگر یہ ادارہ بھی تو ہمارا ہے ہم کیسے اس کی مدد کے فرض سے سبک دوش ہو جائیں گے۔؟

ایک اور ضروری کام کی طرف آپ کے ذریعے قوم کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ کی اس کانفرنس نے ۶۶ سال پہلے قوم کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کرنا شروع کیا تھا۔ ابتدائی دشواریوں کے بعد آپ کی

سعی مشکور ہوئی۔ قوم میں تعلیم کا ذوق عام ہو گیا اور اب یہ صرف متمول اور خوش حال طبقے تک محدود نہیں ہے۔ اب ہونہار، ذہین، شائق، طلبہ کی ایک روز افزوں تعداد تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس کے وسائل سے محروم ہے۔ صرف روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی قیمتی استعدادوں کا بر روئے کار نہ آسکنا بڑا قومی نقصان ہے۔ میری رائے ہے کہ ہم کو ان ہونہار غیر مستطیع طلبہ کا باضابطہ ریاست ریاست، پردیش پردیش، پتا لگانا چاہیے۔ مقابلے کے امتحانوں کے ذریعے، مخصوص Tests کے ذریعے، ملاقاتوں میں، انھیں ڈھونڈنا اور چننا چاہیے اور ان کے لیے تعلیم کے وسائل فراہم کرنے چاہییں۔ اگر کانفرنس اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو ایک ضروری قومی فرض کی انجام دہی کا سامان ہو سکتا ہے۔

دوستو! میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ کی کوشش اور توجہ سے اس کانفرنس کی زندگی کا نیا دور جو آج شروع ہوتا ہے پہلے دور سے زیادہ کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہو اور آزاد ہندستان میں آپ کی مساعی مشکور ہوں۔ آمین۔

علی گڑھ سے خطاب

(یہ خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۲۸ جنوری ۱۹۵۷ء کو پڑھا گیا)

جنابِ والا[1]، جنابِ شیخ الجامعہ[2]، بزرگو، دوستو اور عزیزو!

میں کس طرح اپنی شکر گزاری کا اظہار کروں اس اعزاز پر، جو آپ نے مجھے بخشا ہے۔ اس کا مستحق ہونا، بفرضِ محال، اور آپ بخشتے تو بھی شکر گزار ہونا چاہیے تھا، لیکن آپ نے تو میری نااہلی سے چشم پوشی فرما کر یہ عزت بخشی ہے۔ اس کی وجہ تو آپ کی محبت ہی ہو سکتی ہے اور محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے اور شکر گزاری۔ پھر اس مضمون رنگین کے ادا کرنے میں لفظوں نے کب کب اور کیا کیا شکستیں نہیں کھائی ہیں؟ اب بھی یہ اپنی ہار مانتے ہیں۔

---

[1] پرو چانسلر نواب محمد احمد سعید خاں چھتاری بالقابہ

[2] وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی بالقابہ

جنابِ شیخ جب جنابِ والا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے میرا تعارف کرا رہے تھے تو میں سوچتا تھا کہ کیا میں کوئی اجنبی ہوں جس کا یوں تعارف کرایا جا رہا ہے۔ اور مجھے میر کا وہ مشہور شعر یاد آ رہا تھا جسے مطابقِ حال بنانے کے لیے دوسرے مصرعے کو ذرا بگاڑنا پڑتا ہے:

پتا پتا بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے

یہ کیسے کہوں "جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے" کہ گُل تو خوب جانتا ہے، اس لیے یوں کہوں گا:

گُل بھی خوب ہی جانے ہے ہم کو، باغ بھی سارا جانے ہے

پھر بھی جی چاہتا ہے کہ میں اس دانش گاہ کے اور اپنے تعلق کو جس طرح محسوس کرتا ہوں اُس کا کچھ ذِکر آپ سے کروں۔

میرا دھیان اس وقت ۴۴ برس پہلے کی اس گرم دوپہر کی طرف رہ رہ کر جاتا ہے، جب میں پہلی بار اس دانش گاہ میں پہنچا تھا۔ اپنے دوسرے سینکڑوں ساتھیوں سے ذرا کم اجنبی، کہ میرے دو بڑے بھائی پہلے سے یہاں موجود تھے۔ یہ دونوں یہاں رہ بس کر یہاں کے ہو چکے تھے، میں نووارد تھا۔ ۔ ۔ پھر میں شہر سے ایک جوتا، کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خرید دی تھی۔ شہر گئے تھے ہم پیدل، ادھر سے آئے تھے لکے میں، اس لیے کہ ہاتھ میں سامان اُٹھا کر چلنا اس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا! مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے اپنے کچی بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے

بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا۔ گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے کرتی کی ٹوپی، ترکی کوٹ اور جراب اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی، اور دیر کیسے نہ کرتا، جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا، اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرا دی تھی وہ گھبراہٹ میں سب ذہن سے اُتر گیا اور کئی بار کے بست و کشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا۔ لیکن جب کس بندھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ چوکس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

راستہ معلوم نہ تھا، نہ جانے کتنی دیر اِدھر اُدھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں تلاشِ منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرے کے سامنے آن پہنچا۔ کمرہ بند تھا، دوسرے کمرے بھی سب بند تھے۔ گھڑی دیکھی، یہ بھی اسی دن نئی نئی بھائی صاحب نے دی تھی۔ اس سے پہلے اسکول کے گھنٹے یا سورج کی مدد سے دن کی تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اُس سے زیادہ صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں۔ اور اس جانِ ناتواں نے اس آٹھ منٹ میں خود فراموشی، بازیافت، تلاشِ منزل، گم کردہ راہی اور ناکامیِ سفر کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے!

سچ ہے، وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا، جس

یہ گزرتا ہے اس کی کیفیت بھی اس کا ایک پیمانہ ہے؛ کبھی چند منٹ، انتظار اور مایوسی کے چند منٹ، پہاڑ بن جاتے ہیں؛ کبھی کشفِ حقیقت، قصدِ نیک، مشاہدۂ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحے میں ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں؛ کبھی بے مقصدی بے راہ روی سے بے دلی میں پوری پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس پر حقارت سے ہنستا ہے۔ خیر، تو ہم آٹھ منٹ بعد جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ چارپائیاں باہر نیم کے درختوں کے قریب پڑی تھیں، وہاں بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے ساتھی کوئی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، کوئی گنگناتے، کوئی ہنستے، کوئی ذرا چپ چپ، واپس آنے لگے یعنی جانا، کھانا، آنا، سب ۹۔۱۰ منٹ میں ختم۔ اس زمانے میں اور چیزوں میں تو نہیں البتہ کھانے میں، بہت ہی فوجی شان تھی۔ اس پر زیادہ وقت صرف کرنا بدذوقی سمجھا جاتا تھا اور منتظمین کی طرف سے بھی ایسا اہتمام تھا کہ زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع بھی کم ہی ہوتا تھا۔

یہ اس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آرہی ہے آج؟ شاید اس لیے کہ وہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے، مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دلگیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا؛ اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے؛ بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا؛ اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا

دیکھے، پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں، اس کی سلری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا، اپنی خام تُند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا، سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے، مگر بجھے کوئلے کی طرح سُلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا، صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو و نما دے سکنے کے لیے ان میں زندگی کی تُند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر سیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت، بھی یہیں پہچانی، خلوت و جلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہاں فرماں برداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب، سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی، باغی بنے، نکالے گئے، دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی مگر اس مادر علمی کی طرف دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی، بن باس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا۔ حالات بدلے، ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا، ذمے دارانہ حیثیت سے اس کی خدمت کا موقع میسّر آیا، بُری بھلی جو بن پڑی خدمت کی، اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سرِ شوریدہ کو یہیں بالینِ آسایش نصیب ہو جائے گی، مگر یہ مقدر نہ تھا، صحت کی خرابی فرائض کی انجام دہی میں مخل ہوتی رہی، بالآخر محبت پر فرضِ جاری کے احساس نے غلبہ پایا اور میں آپ سے رخصت ہو گیا۔

آج کا سٹ دل کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے، اس سب پر جو یہاں سے پایا شکرگزاری سے بھرا ہے، اور ان تمام کوتاہیوں پر جو اس دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے میرے لیے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی زندگی کا بڑا انعام ہے۔ آپ اس پر اس نئے اعزاز کا اضافہ کر رہے ہیں۔

من بوئے مست وساقی پر دہد پیمانہ را

جناب والا! رسم سی ہے کہ تقسیم اسناد کے جلسے میں جس شخص کو خطبہ دینے کے لیے بلایا جاتا ہے وہ اعلیٰ تعلیم کے کسی مسئلے یا بعض مسائل کے متعلق اپنے خیالات دانش گاہ کے طا ساتذہ اور کارکنوں کے سامنے رکھتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ایسا نہ کروں، اس لیے کہ جو کہا جاتا ہے وہ محفل آرائی بلکہ وقت گزاری کے سوا بظاہر کسی کام نہیں آتا۔ مگر سوچتا ہوں کہ تکرار ہمیشہ سے تعلیم کا، چاہے افراد کی ہو، چاہے جماعتوں کی، خاصا مؤثر ذریعہ رہی ہے، اس لیے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

سب سے پہلی چیز جو میرے خیال میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے تیزی سے بڑھیں گے اور باوجود اس شور کے جو ہم روز سنتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ لوگ اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، اور اس لیے بے روزگاری بڑھ رہی ہے، اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھے گی اور تعداد کو قابو میں رکھ سکنے کی خام خیالی کا نتیجہ بس یہ ہوگا کہ اس بڑھتی تعداد کے لیے اچھی اعلیٰ تعلیم کے صحیح انتظامات سوچ سمجھ کر اور پوری تیاری کے ساتھ نہیں کیے جائیں گے، معیار تعلیم گرے گا ادھ کچرے گریجویٹ جو کسی مرض کی دوا نہ ہوں گے، لاکھوں کی تعداد میں نکلیں گے، بوجھ بجھکڑ فرمائیں گے کہ تعداد کم کرنی چاہیے اور سمجھیں گے

کہ بڑی دور کی کوڑی لائے اور تعداد ہوگی کہ بڑھتی جائے گی۔ بوجہ جھگڑوں کے ذہن نشین اگر یہ ہو جائے کہ ہزار جتن کرنے پر بھی تعداد بڑھے گی تو شاید اس بڑھتی ہوئی تعداد کو اچھی تعلیم دینے کے انتظامات کی طرف زیادہ دھیان دیا جا سکے۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم ملک میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور اس توسیع کی رفتار کو، سچ یہ ہے، اور بھی تیز ہونا چاہیے۔ ہمارے ملک کے دستور میں ہدایت ہے، صاف ہدایت کہ دستور کے نفاذ کے ۱۰ سال کے اندر ہندوستان کے سب لڑکوں لڑکیوں کے لیے ۶ سال سے ۱۴ سال تک مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہو جانا چاہیے۔ ہم نے دیس کی عام ترقی کے دو پنج سالہ منصوبے بنائے، اور دوسرے منصوبے میں بڑی دیدہ دلیری سے اس ہدایت کو پس پشت ڈال دیا! اور مجھے ڈر ہے کہ دستور کی اس ہدایت پر تیسرے منصوبے میں بھی پورا عمل نہ ہو پائے گا۔ کچھ عجیب سی بات ہے، یہ قومی ترقی کا منصوبہ بنایا جاتا ہے قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے، کسی اور معاملے پر قوم نے اپنے ارادے اور اپنی خواہش کا اس صفائی کے ساتھ اظہار نہیں کیا تھا جتنا کہ تعلیم کے معاملے میں۔ ریلوں کی توسیع کے متعلق، صنعتوں کے قیام کے متعلق، زراعت کے متعلق، آب پاشی کے متعلق کوئی ایسی ہدایت نہیں تھی، تعلیم کے متعلق تھی، وقت کی پابندی کے ساتھ تھی، پھر یہ کہہ دنیا کے وسائل تو محدود ہی ہیں، اگر کسی چیز پر زیادہ خرچ ہوگا تو کسی پر کم کرنا ہی ہوگا اس کھلی ہوئی چوک کو صحیح نہیں بنا دیتا۔ خیر، یہ تو بات میں بات نکل آئی، میں کہہ یہ رہا تھا کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے پھیلاؤ کی جو رفتار بھی اس وقت ہے اس سے اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والوں کی تعداد بڑھے گی، بڑھے گی۔

اگر آپ چن چن کر خاص قابلیت کے لوگوں کو ہی یونیورسٹی کالجوں میں داخلہ دیں گے اور ان کا ٹھیک چناؤ بھی کچھ کھیل نہیں ہے، تب بھی ان چھنے ہوئے لوگوں کی تعداد بھی موجودہ تعداد سے جلد ہی زیادہ ہو جائے گی اور اس وقت جو تعداد ہے اس کے لیے کب ٹھیک اور کافی انتظام ہے۔ کلکتے کے ایک کالج میں ۱۳ ہزار ودیارتھی تعلیم پاتے ہیں، ہاں، کہتے ہیں کہ تعلیم پاتے ہیں۔ اگر جیسا کہ تجویز ہے کہ کسی کالج میں ۸۰۰ سو سے زائد طلبہ نہ ہوں تو اس ایک کالج کے ساتھ ۱۶ اور کالج بنانے ہوں گے۔ اس مفروضہ پر کہ ثانوی تعلیم جلد ایسی ہو جائے گی کہ اس کے ختم پر لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے کام میں لگ جائیں گے اور تھوڑے سے لوگ یونیورسٹی تک جانا چاہیں گے، اعلیٰ تعلیم کے انتظاموں کو نہ بڑھانا، بڑا دھوکا ہوگا۔ ثانوی تعلیم کی درستی کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، جو کوشش ہو رہی ہے وہ میری نظر میں بہت ناکافی ہے لیکن اس پر غلط بھروسہ کر کے اعلیٰ تعلیم کی توسیع کے فرض کو بھلانا بڑی بھول ہوگی۔

یہ تو ہے توسیع کے متعلق میرا خیال۔ لیکن اگر توسیع ارادے سے نہیں ہوئی، تیاری کے ساتھ سوچ سمجھ کر نہیں ہوئی تو وہ ایسی من مانی اوٹ پٹانگ شکلیں اختیار کرے گی اور اس تیزی سے اعلیٰ تعلیم کو ایسا کھوکھلا کر دے گی کہ پھر اس کو سنبھالنا مشکل ہوگا۔ یاد رہے کہ اس نامراد منزل تک پہنچنے میں بہت فاصلہ باقی نہیں ہے۔ طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی نسبت سے استادوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا ہے، اچھے استادوں کے درس گاہوں میں لانے کی تدبیریں بھی کچھ بہت کارگر ثابت نہیں ہو رہی ہیں؛ سامانِ تعلیم، عمارتوں، کتب خانوں میں اس نسبت سے ترقی نہیں ہوئی ہے؛ سارے نظامِ تعلیم میں بیک وقت بڑی بڑی

تبدیلیوں کی تجویزوں نے ابھی جڑ نہیں پکڑی ہے، اس لیے بھی خاصی گڑبڑ سی ہے؛ تعلیم میں انگریزی زبان کی جگہ کے متعلق روز کوئی نیا خیال سامنے آجاتا ہے۔ سب ریاستوں کا ایک سا خیال نہیں ہے۔ یونیورسٹیاں زیادہ انگریزی سے ہی کام لے رہی ہیں۔ اس نے بھی تعلیم کے معیار کو خاصا گرا دیا ہے۔ اگر اس صورتِ حال کی درستی کی طرف فوراً دھیان نہ دیا گیا تو یہ بھی کچھ دن بعد سنبھالے نہ سنبھلے گی۔ ہتھیلی پر سرسوں تو زندگی کے اہم شعبوں میں کم ہی کہیں جمتی ہے مگر تعلیم تو خاص طور پر دیر طلب کام ہے۔ اگر کام شروع ہی نہ کیا جائے یا ٹھیک شروع نہ کیا جائے تو مدت گزرنے پر بھی کچھ نہیں ہوتا۔ اسی لیے جلد از جلد کچھ کرنا چاہیے۔ نئے کالج اور یونیورسٹیاں کھولی جائیں، ان میں اور موجودہ تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والوں اور تعلیم دینے والوں کی تعداد میں ٹھیک نسبت ہو، صرف بڑی بڑی جماعتوں کے سامنے لکچروں سے تعلیم کا کام نہ نکالا جائے بلکہ چھوٹے چھوٹے گروہ ہوں، لکچروں کے ساتھ مذاکرہ Discussion کا طریقہ زیادہ رائج کیا جائے، استاد اور شاگرد میں شخصی تعلق کا امکان پیدا کیا جائے؛ اور تعلیم کے کام میں اچھے استادوں کو لگانے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی جائے۔ امتحان کے طریقے کو بدلا جائے۔ کمیشن پر کمیشن امتحان کے رائج طریقے کی مذمت کرتا ہے اور یہ ہے کہ اپنی پرانی چال پر چلا جا رہا ہے، بلکہ تعداد کی زیادتی کی وجہ سے کچھ اور بگڑتا ہی جاتا ہے۔ کوئی سکنڈری اور انٹرمیڈیٹ اگزامینیشن بورڈ دھیان نہیں دیتا، کوئی یونیورسٹی اپنا امتحان کا طریقہ نہیں بدلتی۔ مجھے خوشی ہے کہ یہاں علی گڑھ میں University — Grants Commission — کی مدد سے اس پر کام ہو رہا ہے

اور مجھے امید ہے کہ اس کام سے ایسے عملی نتائج نکلیں گے کہ یہ یونیورسٹی اپنے یہاں امتحان کا طریقہ جلد بدل سکے گی اور دوسروں کے لیے کہ سب کسی اگوے کی راہ سی تک رہے ہیں اور نئی ڈگر پر قدم اٹھانے میں ہچکچا رہے ہیں، مثال کا کام دے گی۔ یہ بڑی ذمّے داری کا اور خاصا پیچیدہ کام، مگر ایسے کام بھی کرنے ہی سے ہوتے ہیں، باتیں بنانے سے نہیں بنتے۔

طریقۂ تعلیم اور طریقۂ امتحان میں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نصاب تعلیم کا سوال بھی چلا چلا کر اپنی طرف متوجّہ کر رہا ہے۔ یونیورسٹی کمیشن کی سفارش کے مطابق تین سال کی ڈگری کی پڑھائی میں General Education Courses کے جاری کرنے کا مسئلہ اس وقت سامنے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کے حل کرنے میں تعلیم کی ماہیت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ منفرد الگ الگ چیزوں سے واقفیت نہ صحیح معنوں میں علم ہے، نہ ذہن کی تربیت کا سامان۔ ذہن کی تربیت کہ ایک معنی میں تعلیم کی مجمل تعریف ہے، ذہن کو مناسب غذا پہنچانے اور اس کو ہضم کرنے، پچانے کی ورزش اور مشق کا موقع فراہم کرنے سے ہو سکتی ہے۔ ذہن کی غذا ہوتی ہیں تمدّن کی گوناگوں چیزیں کہ یہ خود ذہن انسانی کی تخلیقات ہوتی ہیں۔ ان میں ذہنِ انسانی اپنی توانائیوں کو محفوظ کر دیتا ہے۔ جب کوئی نیا ذہن انھیں اپنے اندر لیتا ہے، انھیں اپناتا ہے تو یہ توانائیاں پھر سے ابھر کر اس نئے ذہن کی تربیت کا کام

کرتی ہیں پوری تاثیر کے ساتھ تب ہی جب بنانے والے ذہن اور پانے والے ذہن کی ساختوں میں مناسبت اور مشابہت ہو۔ لیکن دوسری تمدنی چیزوں سے آشنائی اور تعارف بھی ذہن کی قوتوں کو ابھارتا ہے اور اپنے مناسب حال تمدنی چیزوں سے پوری طرح بہرہ یاب ہونے کی صلاحیت کو چمکاتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ تمدنی اشیاء کی اگر موٹی موٹی تقسیم ہو سکے تو ہر قسم کی چیزوں سے ایک بار نشو پذیر ذہن کو دوچار ہونے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ان میں سے اس کا انتخاب بصیرت اور تجربے کی بنا پر کر سکے، جس کے لیے وہ خصوصیت سے موزوں ہے، اور دوسری قسموں سے بھی یک قلم نابلد نہ رہے۔ ان مسائل سے آگاہ ہو جائے جن سے ایک متمدن ملک کی جمہوریت میں سب ہی شہریوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ ایک مفکر نے اس پورے میدان کے تین بڑے بڑے حصے کیے ہیں، ان کا ترجمہ نہیں کرتا انگریزی اصطلاحیں بولے دیتا ہوں کہ میری زبان کا دامن تو نہ جانے کتنے چمنوں کے پھولوں سے مالامال ہے۔ ہاں وہ تین قسمیں ہیں Humanities-Social Sciences-Natural Sciences اگر یہ ہو سکتا ہے کہ ان تینوں شعبوں سے مناسب واقفیت ثانوی تعلیم کے زمانے میں ہو جاتی، ایسی کہ ان کی جدا جدا حیثیت کا واضح احساس ہو جاتا تو بہت اچھا تھا۔ ثانوی تعلیم کی نئی تجویزوں میں اس کا لحاظ رکھا بھی گیا ہے، مگر ابھی ایک عرصے تک اس کی امید کرنا غلطی ہوگی کہ یہ واقفیت محض سطحی سے کچھ بھی زیادہ گہری ہو سکے گی۔ شاید اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا، ثانوی تعلیم کی مدت میں اور

اضافے کا، یعنی جب ثانوی تعلیم ۱۱ سال کی جگہ ۱۲ سال میں پوری کی جایا کرے گی، میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ضرور کرنا پڑے گا، لیکن ابھی تو تدریج جو آدھی بات کو پوری بات پر ہمیشہ ترجیح دیتی ہے ۱۱ سال ہی پر مشکل سے راضی ہو رہی ہے۔ بہر حال ثانوی تعلیم سے اس کام کو پورا کرنے کی توقع ابھی بہت قبل از وقت ہے۔ اس لیے یونیورسٹی کی پہلی سند کے لیے ان تینوں میں کچھ کچھ دسترس کو لازم کرنے کی تجویزیں ہو رہی ہیں، اور میں دل سے ان کا حامی ہوں۔ ان تینوں میں طرح طرح کے ذہنوں نے اپنی پسندوں، اپنی آرزوؤں، اپنی تمناؤں، اپنی بے تابیوں، اپنی تسکینوں، اپنی جستجوؤں، اپنی دریافتوں، اپنی رمز شناسیوں اور نقاب کشائیوں کی روئدادیں محفوظ کر دی ہیں۔ اپنے انداز نظر، اپنے طریقۂ تحقیق کی یادگاریں قایم کر چھوڑی ہیں۔ ان سے نشو پذیر ذہن کو، اپنے مخصوص رجحان کے متلاشی ذہن کو دوچار کرنا، اس کو نشو و نما کے صحیح راستے پر ڈال دینا ہے اور اس کی مناسبت خاص کے پیش نظر اسے اپنے مخصوص میدان فکر و عمل کے انتخاب کا موقع دینا ہے۔ یہ موقع پہلی سند کے بعد تخصیص کی منزل میں اپنا پھل لائے گا۔ اب ہوتا یہ ہے کہ پہلے ہی سے طالب علم کا میدان جستجو محدود کر دیا جاتا ہے اور اس کے ابتدائی قدم بھی اس بات کا خیال رکھ کر اٹھوائے جاتے ہیں کہ اسے اسی میدان کا مرد بننا ہے، اسی میں تخصیص کرنی ہے۔ اور بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ وہ تخصیص کی منزل تک پہنچتا ہی نہیں، اس کے سب ابتدائی قدم اس منزل کی تیاری بن کر رہ جاتے ہیں جو مقصود ہی نہ تھی۔ یہ قدم اکثر و بیشتر منفرد واقفیت پر مشتمل ہوتے ہیں، مضمون کے مرکزی تصورات اور بنیادی خیالات کا ذکر تک نہیں آنے پاتا۔ مسافر درخت پر درخت دیکھتا ہے اور جنگل نظر سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ تخصیص کے فوائد سے بھی محروم رہتا ہے اور تمدنی زندگی کے بنیادی افکار اور رجحانات سے بھی محض ناآشنا۔

اپنے نصابوں پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ان میں جماعتی اور سیاسی بصیرت کی نشوونما کا، انسان کی تخلیقی کاوشوں، ادب، موسیقی، آرٹ سے لطف اندوز اور بہرہ یاب ہونے کا، کائنات قدرت اور عالمِ انسانی پر مفکرانہ نظر ڈال سکنے کا امکان کہاں ہے اور کتنا ہے؛ بس ایک محدود حلقے کی بہت سی چیزوں کے نام اور صفتیں طالب علم کو یاد ہیں، خود ان کے روابط بھی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔ زندگی جن جاندار خیالات سے متاثر ہے یہ ان سے ناآشنا ہے۔ اپنے سماجی اور طبیعی ماحول کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اپنی جماعتی اور سیاسی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھا سکنے کے لیے یک سر نااہل ہے؛ شعر کے لطف سے محروم، موسیقی کے لیے اس کے کان بہرے، نقش و رنگ کی کرشمہ سازیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی۔ تخصیص کرنے والا تو اپنی تخصیص سے کچھ فائدہ بھی اٹھاتا ہے، اگرچہ وہ بھی اپنی دنیا تنگ کر کے یہ فائدہ بہت مہنگے داموں خریدتا ہے، مگر یہ غریب پہلی سند والا تو اس تنگ دامانی کے باعث نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ اس صورتِ حال کو بدلنا ضروری ہے اور سب پہلی سند والوں کے لیے علمی، ادبی، جمالیاتی اور اخلاقی اقدار سے تعارف کا اہتمام لازم۔ تجویز یہ ہے کہ سب کے لیے ——

Humanities, Natural Sciences, Social Sciences

اور زبان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے؛ پہلی سند کے بعد جو چاہے جس میدان میں تخصیص کرے۔ یہ نیا تجربہ ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن اگر یہ بغیر خوب سوچے سمجھے اور بغیر پوری تیاری کے کیا گیا تو مجھے ڈر ہے کہ ایک سطحی تبدیلی سے زیادہ ثابت نہیں ہوگا اور رواج عام کے خلاف ہونے کی وجہ سے بہت جلد اس کی ناکامی کا اعلان ہو جائے گا، اور یارانِ سست گام کہ ان کی تعداد ہماری اعلیٰ تعلیم کے مرکزوں میں کچھ کم نہیں، فاتحانہ چلا اٹھیں گے، دیکھیے

ہم نہ کہتے تھے! اس نئے نصاب کے بنانے میں یاد رکھنا ہوگا کہ اس وقت کے نصاب کی طرح صرف منفرد معلومات مقصود نہیں اس لیے کہ اگر ہر شعبے میں اسی حساب سے منفرد معلومات کا بوجھ یک جا کر دیا گیا تو طالب علم غریب اسے اٹھا کیسے سکے گا۔ ضرورت ہوگی بڑے کڑے انتخاب کی، صرف بنیادی تصورات کو پیش کرنا ہوگا، خبر کی بھرمار نہ ہوگی، نظر پیدا کرنے کی کوشش ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ اس میدان میں بھی یہ یونیورسٹی اپنے اساتذہ کے غور و فکر اور محنت سے ایسی تیاری کرے گی کہ اس کے کام کو اعلیٰ تعلیم کے حلقوں میں ایک امتیازی شان حاصل ہو سکے گی۔

جناب والا! جن ضرورتوں اور تجویزوں کا ذکر اوپر کر چکا ہوں ان سب سے یونیورسٹی کے مصارف بڑھیں گے، سرکاری امداد پر دن بہ دن زیادہ انحصار ہوتا جائے گا۔ اسی یونیورسٹی کا نہیں، ملک میں تمام اعلیٰ تعلیم کے مرکزوں کا۔ پھر سائنس اور صنعت، طب اور زراعت، کی تعلیم میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا ہوتا ہے، ملک کو اس کی شدید ضرورت بھی ہے، یہ روپیہ بھی سرکار ہی دے گی۔ آپ نے جیسے میڈیکل کالج کے لیے کوئی ۶۰ لاکھ روپیہ غیر سرکاری طور پر اکٹھا کر لیا ایسا تو سب یونیورسٹیاں نہیں کر سکیں گی۔ غرض ملک میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے اپنے کام کی اصلاح اور توسیع کے لیے روز بروز حکومت سے زیادہ وابستہ ہو جائیں گے۔ حکومت تعلیم پر فیاضی سے روپیہ صرف کرنے کی نیت بھی رکھتی ہے یہ سب کچھ بہت اچھا ہے، مگر دل میں ایک وسوسہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی آزادی کہیں خطرے میں نہ پڑ جائے۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کے راج میں ہماری اعلیٰ تعلیم کے ادارے بالکل غیر ملکی سیاستیں کسے ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ انھیں قومی زندگی میں وہ تنویری اور تخلیقی مرتبہ حاصل نہیں تھا جو ان کا منصب ہونا چاہیے۔

آزاد ہندستان میں تعلیم گاہیں اگر قومی زندگی کی نشوونما میں اس کے نکھار اور سدھار میں اپنا فرض اس طرح انجام دینا چاہیں گی جیسا کہ ان کا حق ہے تو انھیں اپنے کام میں آزادی درکار ہوگی۔ دانش گاہیں ذہنی اور اخلاقی زندگی کا مرکز ہوتی ہیں اور ذہنی اور اخلاقی زندگی آزادی ہی میں پھلتی پھولتی ہے، نہیں، آزادی اس کے لیے شرط حیات ہے۔ آزادی کے بغیر کوئی دانش گاہ نہ تمدنی سرمایہ کو نئی نسلوں تک صحیح طور پر پہنچانے کا کام کر سکتی ہے نہ اس کی صحت مند تنقید و تطہیر کا؛ نہ جہالت اور توہمات اور تعصبات کے لشکروں کو پسپا کر کے علم و دانش، اخلاق حسنہ اور حیات صالحہ کے گڑھ سر کر سکتی ہے۔ نہ اچھی سیرت و تعمیر کا کام کر سکتی ہے نہ اسے شخصیت کے مقام بلند تک پہنچانے کا۔ مبارک اور خوش نصیب ہے وہ قوم جس کی حکومت اعلیٰ تعلیم کے اس گر کو سمجھ لیتی ہے، اپنی دانش گاہوں کو بے دریغ وسائل فراہم کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی اور ان کی آزادی میں ایک لمحے کے لیے مخل نہیں ہونا چاہتی۔ یہ حکومت کی صحت اقدار کی کسوٹی ہے، مجھے یقین ہے کہ ہماری آزاد حکومت اس امتحان میں پوری اُترتی رہے گی۔

لیکن، جناب محترم، ہمیں جو دانش گاہوں سے وابستہ ہیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ یہ آزادی بھی ہر دوسری آزادی کی طرح اپنے اوپر آزادی سے پابندیاں لگاتی ہے۔ صحیح آزادی کہتے ہی ہیں خوشی سے اپنے اوپر ضروری پابندیاں لگانے کو، بے راہ روی، من مانے تلون کو آزادی نہیں کہتے۔ تلاشِ حق اور تبلیغِ حق میں آزادی کے حق کے ساتھ دانش گاہوں پر سماجی ذمے داریوں کو خوشی اٹھانے کا فرض بھی عاید ہوتا ہے۔ ہندستان کی دانش گاہوں کی سماجی ذمے داری بہت بھاری ہے۔ ملک صدیوں کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔ غلامی، ذہن اور روح کا بڑا مہلک روگ ہوتی ہے۔ غلام،

ذمے داری کے تصور سے عاری ہوتا ہے اور اخلاق کے تصور سے بے نصیب، آزادی میں قدم رکھتے ہی اپنے ہر فعل کے حسن و قبح کا بوجھ اس کے سر آپڑتا ہے۔ اخلاق کی پابندیاں اپنے سر لے کر ہی اس کو سچی آزادی نصیب ہوتی ہے۔ غلامی سے آزادی میں یہ سفر بڑا دشوار گزار سفر ہوتا ہے۔ ذہن اور روح کی قوتوں کو بے دار کرنا ہوتا ہے، پرانی عادت بار بار قدموں میں لغزش پیدا کرتی ہے، اقدار صالحہ کے سہارے ہی سے ان قدموں کو قوت ملتی ہے، رہروؤں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ نووارد اس نئی آزاد دنیا میں اجنبی اجنبی سے لگنے لگتے ہیں۔ ان کے ذہنوں کو اقدار کے معاملے میں صاف کرنا، ان کے جذبات کو فلاح قومی کے ساتھ وابستہ کرنا، انھیں خود غرضی اور نفس پروری کی تنگ و تاریک گھاٹیوں سے نکال کر مفاد جماعتی کی روشن وسعتوں کا خوگر بنانا، فرقہ وارانہ وفاداریوں کو نکھار کر انھیں وحدتِ قومی کا دل دادہ بنانا، ان کی تن آسانیوں کو مفید جماعت مشقت میں بدلنا، غرض قومی مزاج کو آزادی کے مطالبوں کے مطابق بنانے کا کام بڑی حد تک دانش گاہوں کا کام ہے۔ یہ کام چوں کہ آزادی ہی میں ہو سکتا ہے اس لیے ہر دانش مند، آزادی دوست، جمہوری حکومت، دانش گاہوں کی آزادی میں خلل انداز ہونے سے باز رہے گی۔ مگر دانش گاہوں کو بھی یہ مہتم بالشان کام انجام دے کر اپنے کو اس آزادی کا مستحق ثابت کرنا ہوگا۔ اس وابستگی کی بنا پر جو مجھے اس دانش گاہ سے رہی ہے اور ہے، جی چاہتا ہے کہ کاش یہ اس میدان میں اوروں سے آگے رہتی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسے اوروں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی اس کا موقع ہے کہ یہ آزاد ہندوستان کی ذہنی اور روحانی قیادت میں اوروں سے آگے رہے۔ میری دانست میں کسی ہندی دانش گاہ کے طلبہ میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی ایسی اور اس نسبت میں آمیزش نہیں ہے جتنی کہ یہاں ہے۔ اس کے اساتذہ

میں بھی یہ تنوع جس طرح جلوہ گر ہے دوسری جگہ کم ہے۔ اس کی اقامتی زندگی کی روایتیں اسے ایک مثالی علمی بستی بنانے میں سازگار ہیں۔ آزادی کے بعد بڑی مایوسی کے دور سے گزر کر خود اعتمادی حاصل کی ہے اور نئے آزاد سماج کے تجربے نے اس کے ساتھ ایک تازہ اور شاداب تعلق خاطر پیدا کیا ہے۔ اس سے یہ توقع کسی طرح بے جا نہیں کہ یہ صالح انفرادی اور اجتماعی زندگی، ذمے دار شہریت، بے لاگ تحقیق، نڈر تنقید، بے لوث خدمت، بے باک صداقت، مخلصانہ تعاون باہمی، ادب، تمیز، سلیقہ اور سب سے زیادہ وحدت قومی کے تصور میں سرشاری کی خصوصیتوں سے ممتاز، ایک تعلیمی بستی بن جائے گی جس پر ہمارا وطن ناز کر سکے گا۔ مبارک ہے وہ دانش گاہ جس کے طلبا، اساتذہ اور کارکنوں کی مشترک کوشش سے اگر بغیر سب کی کوشش یہ کام ہونے والا نہیں، یہ منصوبہ بروئے کار آ سکے۔

نوجوان دوستو! تم جو آج سندیں لے کر عرف عام میں زندگی میں قدم رکھ رہے ہو تم سے بھی کچھ کہنا چاہیے۔ کیا کہوں؟ الکشن کا موسم ہے اگر سیاست کے میدان میں انتخاب کا امیدوار ہوتا تو میرا کام آسان ہوتا۔ تمھاری تعریف کرتا، مبالغہ کے ساتھ تعریف، خوشامد کا جادو بڑے بڑے گھاگھوں پر چل جاتا ہے، تم ایسے کہاں کے دانا ہو کر اس سے متاثر نہ ہوتے، تم خوش ہو جاتے، مجھے ووٹ مل جاتے۔ کہہ سکتا تھا کہ تمھارے ہاتھوں میں قوم کا مستقبل محفوظ ہے، جی ہیں، دنیا کا مستقبل تم ہمارے مستقبل کی امید ہو، اس کی درخشانی کا وعدہ ہو۔ مگر کیا کروں اور کیسے یہ نہ سوچوں کہ تم سے پہلے اور لوگ بھی اس دیس میں نوجوان رہ چکے ہیں وہ بھی تو امید تھے، وہ بھی تو ایک وعدہ تھے، پر وہ وعدہ جو وفا نہیں ہوا، وہ امید جو بر نہیں آئی اگر تم امید ہو اور وعدہ تو اس کا پورا ہونا تمھاری کوشش، ساری زندگی کی پیہم کوشش پر منحصر ہے۔ اس پر منحصر ہے کہ تم سمجھ لو کہ زندگی خاصی گمبھیر چیز ہے، خالی لفظوں سے باتوں سے اس کی ساخت نہیں

ہوتی۔ یہ خالی فقرےبازی نہیں، محض شخصی نفع نقصان کا کھاتا نہیں، خود بینی اور خود پروری نہیں،
خالی آرام و آسائش کی تلاش نہیں، اچھی سی تنخواہ اور بالائی یافت کا نام نہیں کہ بس بی۔اے
کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے۔ جس دھرے پر زندگی گردش کرتی ہے وہ سود و زیاں،
آرام و تکلیف، حظ و کرب کا دھرا نہیں۔ وہ دھرا ہے خوب و زشت، اعلیٰ و ادنیٰ کا، ترقی اور
انحطاط کا۔ بڑی کٹھن چیز ہے زندگی، پر بڑی دلکش چیز بھی ہے یہ، اعلیٰ کو جان کر ادنیٰ پر راضی
ہونے کو معصیت جانتی ہے اور خوب سے خوب تر کی طرف بڑھے جانے کی پیہم سعی کا نام ہے۔
زندگی ایک مشن ہے، زندگی خدمت ہے، زندگی عبادت ہے۔ اس خدمت کو انجام دینے،
اس مشن کو پورا کرنے، اس عبادت کا حق ادا کرنے کے لیے تمھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی
فطری صلاحیتوں کا پتا چلانا ہوگا، اور ان میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنا ہوگا۔ بے لاگ فکر
کی آنچ میں تپا تپا کر اور مخلصانہ عمل کے ہتھوڑے سے اسے کوٹ کوٹ کر اپنی زندگی کے
مسالے کو استواری اور پائیداری بخشنی ہوگی۔ ارادے کی قوت کو مشق سے مضبوط کرنا ہوگا اور
قابو میں لینا ہوگا تاکہ وہ بس کبھی کبھی ایک طغیانی عمل کی صورت میں اپنے کو ظاہر نہ کیا کرے
بلکہ ایسا معتبر منبع ہو کہ اس سے ایک مدت تک توانائی حاصل کی جاتی رہے اور ان کاموں
میں اس کو لگایا جا سکے جو واقعی کرنے کے کام ہیں اور جن کی ماہیت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ
اپنی تکمیل کے لیے ایک زمانہ چاہتے ہیں۔ اپنی عقل اور سمجھ کی برابر تربیت کرنی ہوگی تاکہ
ہمیشہ دوسروں ہی کا منہ نہ تکو، خود فیصلے کر سکو، خصوصاً ایسے فیصلے جو تم ہی اپنے لیے کر سکتے ہو
اور جن سے کوئی مفر نہیں ہوتا۔ تمھیں اپنی نظر کو برابر وسعت دینے کی مشق کرنی ہوگی تاکہ دوسروں
کا نقطۂ نظر بھی سمجھ سکو اور اس کے رد و قبول سے پہلے اسے بے تعصبی سے جانچ سکو۔ تمھیں
اپنی زندگی کے تنگ شخصی دائرے کو وسیع کر کے اسے دوسری زندگیوں سے ملانا ہوگا؛

اپنی ہمدردیوں کو عام کرنا ہوگا، جماعتی ذمے داری کا بوجھ خوشی خوشی اٹھانا ہوگا، شخصی مفاد اور اپنے چھوٹے گروہ کے اغراض کو وسیع تر اور اعلیٰ تر اغراض کا تابع بنانا سیکھنا ہوگا؛ اپنے کام اور اپنے ماحول پر کبھی کبھی بے گانہ وار ناقدانہ نظر کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی؛ جماعتی اور عمومی مسائل کو سائنٹیفک تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کا اپنے کو خوگر بنانا ہوگا؛ اپنے شخصی جماعتی تعصبات پر کڑی نگرانی رکھنی ہوگی اور ہر طرح کے پروپیگنڈا کی فریب کاریوں سے اپنے فکر و فہم کو محفوظ رکھنے کے جتن کرنے ہوں گے۔ اپنی زندگی میں یہ صفتیں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ، ساتھ ساتھ اس لیے کہ یہ کام کبھی نہ ختم ہونے والا کام ہے، اس کو ختم تک پہنچا کر جو لوگ زندگی کو کام میں لگانا چاہتے ہیں، انھیں پھر زندگی کی مہلت نہیں ملتی، ہاں، تو ان کو پیدا کرنے کی کوشش کے ساتھ ہی ساتھ اپنے کو کسی قدر اعلیٰ کا خادم بنا لینا کہ اسی سے آنی و فانی زندگی میں ثبات و دوام کا رنگ آتا ہے، اور بے معنی جیے جانا بامعنی زندگی بن جاتا ہے۔ تمھارا راستہ تمھاری فطری انفرادیت سے شروع ہوتا ہے، اپنی انفرادی صلاحیتوں کی ہر جہتی نشو و نما کرکے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرکے مستقل سیرت کے مقام سے گزرتا ہے اور جب یہ سیرت کسی اعلیٰ قدر مطلق کی خدمت گزار بن جاتی ہے تو یہی راستہ شخصیت اخلاقی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ بہت دشوار گزار ہے، مگر انسانی زندگی کے شایانِ شان راستہ یہی ہے اور باوجود اپنی صعوبتوں کے بڑا ہی دلکش ہے یہ راستہ۔ اس پر چلنے کے لیے کمر کس لو، میرے نوجوان دوستو۔ مسافروں کا نگہبان اور راہ گیروں کا رکھوالا تمھارے سفر کو [illegible]

ابراہیم الٰہ آبادی ۱۵ ۵/۹۱ء